ممتاز علماء ورفقاء

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

بارِ اوّل

۱۴۴۵ھ - ۲۰۲۳ء

نام کتاب	:	ممتاز علماء ورفقاء
مصنف	:	سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
صفحات	:	۱۴۹
تعداد اشاعت	:	۱۱۰۰
قیمت	:	۱۵۰/روپے

فہرست

۱	پیش لفظ	۵
۲	مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ	۷
۳	علامہ سید سلیمان ندوی	۱۷
۴	مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ	۲۱
۵	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۳۰
۶	حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی	۳۳
۷	حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ	۳۷
۸	مولانا محبّ اللہ لاری ندوی	۴۱
۹	اک روشن دماغ تھا نہ رہا	۴۴
۱۰	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	۴۹
۱۱	حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ	۵۴
۱۲	مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ	۶۰
۱۳	ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی	۶۴
۱۴	فؤاد سیزگین	۷۰
۱۵	ڈاکٹر الحاج علی ملپا	۷۴
۱۶	مولانا غزالی خطیب ندویؒ	۷۷
۱۷	مولانا عبداللہ عبدالتواب مدنیؒ	۸۰
۱۸	آہ! کرنل محسن جلیل شمسیؒ	۸۴
۱۹	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ	۸۸

۲۰	مولانا ڈاکٹر محمد لقمان سلفیؒ	۹۱
۲۱	مولانا محمد اقبال ملا ندویؒ	۹۵
۲۲	مولانا مفتی عبداللہ مظاہریؒ	۹۷
۲۳	مولانا فضل ربی ندویؒ	۹۹
۲۴	مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ	۱۰۲
۲۵	مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ	۱۰۹
۲۶	قاری مشتاق احمد پرتاب گڑھیؒ	۱۱۳
۲۷	مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ	۱۱۷
۲۸	مولانا ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی ندوی	۱۲۰
۲۹	مولانا سید جلال الدین عمریؒ	۱۲۲
۳۰	مولانا باقر حسین قاسمیؒ	۱۲۳
۳۱	الحاج مظفر کولا رحمۃ اللہ علیہ	۱۲۶
۳۲	مولانا مبارک حسین ندویؒ	۱۳۱
۳۳	حضرت مولانا یوسف متالاؒ	۱۳۳
۳۴	تذکرہ علمائے نگرام	۱۳۵
۳۵	عالی جناب احمد حسن صاحب	۱۳۸
۳۶	مولانا قاضی محمد قاسم مظفر پوری	۱۴۰
۳۷	حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۴۱
۳۸	ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب	۱۴۳
۳۹	مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ	۱۴۶

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین محمد وعلی آله و صحبه أجمعین ، أما بعد

پیش نظر مجموعہ ان مقالات ومضامین پر مشتمل ہے، جو راقم الحروف نے متعدد سمیناروں یا یادگاری مجلّات کے لئے لکھے، ان مضامین میں ذاتی تعلق وتأثر کو خاص طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ کوئی باضابطہ سوانح نہیں، بلکہ منتشر تأثرات واحساسات پر مشتمل کتاب ہے۔

راقم الحروف کو سیرت وسوانح سے ابتدا ہی سے دلچسپی رہی ہے، قلبی اور اندرونی طور پر موضوع سے لگاؤ کی وجہ سے میں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اہم کتاب (پرانے چراغ) تین جلدوں میں مکتبہ فردوس سے شائع کی، اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی بھی مکتبہ سے شائع ہوئی، بحمداللہ البعث الاسلامی کی ابتدائی فائلوں میں ساعۃ مع العارفین یا فی رحاب العارفین کے نام سے ایک سلسلہ مضامین لکھنے کی توفیق ملی، اس کا مجموعہ ساعۃ مع العارفین کے نام سے دوجلدوں میں دارالمقطم مصر اور مکتبہ فردوس سے شائع ہو چکا ہے، نیز اس کا اردو ترجمہ تذکرہ اہل دل کے نام سے بھی شائع ہوا ہے، مزید البعث الاسلامی کے وفیاتی کالم میں دنیا سے رخصت ہونے والی شخصیات پر کچھ

نہ کچھ لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

ادھر قریبی سالوں میں قافلہ علم وادب کے نام سے چھ سو اکہتر (٦٧١) صفحات پر مشتمل ایک کتاب مکتبہ ندویہ سے شائع ہوئی، جس میں ماضی اور حال کی نمایاں شخصیات کا تذکرہ ہے۔

اس مجموعہ کا نام ''ممتاز علماء ورفقاء'' رکھا ہے، کیونکہ اس میں کچھ مقالات تاریخ ساز شخصیات پر ہیں، اور کچھ معاصرین اور خوردسال احباب پر، ان مقالات میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے تا کہ قارئین کو تشنگی کا احساس نہ ہو، بقیہ تاریخی اور سوانحی معلومات تو وہ دوسری کتابوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اس مجموعہ کی تیاری میں عزیز گرامی مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) کی ذاتی دلچسپی اور کوشش کا دخل ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے اور اس مجموعہ مضامین کو قبول فرمائے۔

ربنا تقبل منا، إنك أنت السميع العليم، وتب علينا، إنك أنت التواب الرحيم، وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وعلى آله و صحبه أجمعين.

سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
١٢/ ربیع الثانی ١٤٤٥ھ

مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ:

ایک عہد ساز شخصیت

آسمان علم کے درخشاں ستارے:

برصغیر میں علمائے فرنگی محل کا تذکرہ ایک عظیم تاریخ کی یادگار ہے،انہوں نے اگرچہ ہندوستان میں آنکھیں کھولیں،لیکن ان کی خدمات کے اثرات پورے عالم اسلام پر محسوس کئے گئے،علمائے فرنگی محل کی شہرت وناموری ملانظام الدین کے ذریعہ ان کے تیار کردہ نصاب تعلیم اوراس کے جاری کرنے سے ہوئی،ان کے والد ماجد ملا قطب الدین تھے،جو قصبہ سہالی ضلع بارہ بنکی کی طرف نسبت رکھتے تھے،ملا قطب الدین علوم وفنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اورعزلت وگوشہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے،وہ اپنے درس وتدریس میں پورا انہاک رکھتے تھے،یہاں تک کہ انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر کی ملاقات کی دعوت کو مسترد کردیا،اورعدیم الفرصتی کا اظہار کرکے حاضر ہونے سے معذرت ظاہر کردی،اوروہ اپنے تعلیمی مشغلے اورتدریس کی خدمت میں برابر مصروف رہے،ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے اپنے مخالفین کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کیا،یہ واقعہ رجب ۱۱۰۳ھ،مطابق مارچ ۱۶۹۲ء کو پیش آیا۔

اس سلسلہ میں علامہ شبلیؒ نے اپنے مقالات میں لکھا ہے:

’’سہالی میں مشہور دو خاندان آباد تھے: انصاری حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے،عثمانی حضرت عثمانؓ کی اولاد سے تھے،ملا قطب الدین انصاری تھے............ایک دن عثمانی ملا قطب الدین کے گھر چڑھ آئے،اوران کو قتل کرکے گھر میں آگ لگادی۔‘‘

فرنگی محل کی وجہ تسمیہ:

اس کے بعد ملا قطب الدین کا یہ خاندان لکھنؤ منتقل ہوا، اور فرنگی محل نامی کوٹھی میں مقیم رہا، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اپنی کتاب (آثار الأُوَل من علمائے فرنگی محل) میں فرنگی محل کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں لکھا ہے:

" ذکروا أن تاجرا من أهل فرنسا جاء مستأمنا فی الهند زمن السلطان أکبر المذکور أشهر السلاطین المغلیة ودخل لکهنؤ وبنی بها بیتا اشتهرت باسم حویلی فرنگی أو فرنگی محل ، فلما تمت مدة قیامه واستیما نه ترك الهند وصار مکانه نزولا فی بیت المال حسب قواعدهم، ثم لما استُشهد ملا قطب ، وأراد أبناؤهم أن ینقلوا عن وطنه إلی موضع آخر أعطاهم السلطان أورنگ زیب عالمگیر هذه الدار المشهورة بفرنگی محل، فلما استوطنوا صارت دار العلم والعمل، ولکن أسمها السابق لم یتبدل، هذا هو الوجه الأصلی للتسمیة بهذه الاسم، أما ما قال بعض التلامذة من الأفاغنة وغیرهم أنه کان فی الأصل فرهنگی أي الفهم، ثم سقطت الهاء لکثرة الاستعمال ، فلیس بشیئ الا أنه توجیه حسن لائق لهذه الدار ، والله أعلم بحقیقة الحال " (ص: ٥)

(بادشاہ اکبر کے زمانہ میں ایک فرانسیسی تاجر ہندوستان آیا اور لکھنؤ میں اس نے ایک حویلی فرنگی محل کے نام سے بنائی، ایک مدت تک وہ اس میں رہا، پھر چلا گیا، اب یہ حویلی حکومت کی تحویل میں آ گئی، ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ سہالی سے منتقل ہونا چاہتے تھے، چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر نے لکھنؤ کی یہ حویلی ان کو ھبہ کی، تو یہاں خاندان اس میں آباد ہو گیا، اور تعلیم وتربیت کا مرکز قرار پایا، لیکن اس کا پرانا نام باقی رہا، یہی اس کی اصل وجہ

تسمیہ ہے، بعض افغانی اور دوسرے حضرات نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ فرنگی اصل میں فرہنگی ہے، جس کے معنی فہم وفراست کے ہوتے ہیں، کثرت استعمال سے (ہ) گرگئی ہے، لیکن یہ مستند بات نہیں ہے، اگر چہ ایک نکتہ کے طور پر تسلیم کی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کو اصل معاملہ کا علم ہے)

درس نظامی اور اس کے عالی مقام حاملین:

ملا قطب الدین جو ملا نظام الدین کے والد ماجد تھے، انہوں نے اپنے زمانہ تدریس میں ایک نصاب تیار کیا تھا، جس پر وہ خود کار بند تھے، اس کے بعد ان کے صاحبزادے ملا نظام الدین نے اس کو اپنا لیا، اور طلبائے علوم دینیہ کو درس دینا شروع کیا، پھر یہ نصاب تعلیم درس نظامی کے نام مشہور ہوا، اور ارباب مدارس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اس نصاب کی بنیادی کتابیں آج بھی داخل درس ہیں۔

فرنگی محل کے اس ادارے سے بہت جید اور ممتاز علماء پیدا ہوئے، ان میں چند حضرات کے اسماء گرامی کچھ اس طرح ہیں: ملا مبین فرنگی محلی جو معقولات کے بڑے عالم تھے، بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی، مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلی، مشہور عالم دین اور فقیہ، مولانا عبد المجید فرنگی محلی، مولانا قیام الدین محمد عبد الباری فرنگی محلی، مولانا عبد الرشید فرنگی محلی۔ فخر المتأخرین مولانا عبد الباری فرنگی محلی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۲۶ء) اپنے عہد کی نمایاں شخصیت تھے۔ عالم اسلام کے اہم علماء میں آپ کا شمار تھا، دینی، تعلیمی، ملی اور عالمی میدانوں میں آپ کے نقوش جلی حروف میں ثبت ہیں، آپ نے اگر چہ اپنی عمر کی اڑتالیس بہاریں دیکھیں، لیکن اس مدت میں ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی عظیم خدمت انجام دی، ان کا لقب قیام الملۃ والدین تھا، اور الأسماء تنزل من السماء (نام آسمان سے اترتے ہیں) کے بموجب اللہ تعالیٰ نے ان کو واقعی دین وملت کی خدمت کرنے والا بنا دیا۔

مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے ۱۸۷۸ء میں آنکھیں کھولیں، اور مولانا عبد الباقی

اور مولانا عین القضاۃ سے تعلیم حاصل کی ،عراق اور عرب کے علماء سے اجازت حدیث حاصل کی ،انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں ،اور کتابوں پر حواشی لکھے ،متعدد فنون میں ان کی تصنیفات ہیں ،ان میں صرف ،نحو ،فلسفہ ،منطق ،فقہ ،تفسیر ،حدیث ،میراث ،تاریخ ، تصوف وسلوک وغیرہ موضوعات قابل ذکر ہیں ،مولانا نے دو نکاح ہوئے ،جن سے کئی اولادیں ہوئیں اور ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔

قابل رشک زندگی کے چند پہلو:

مولانا کی زندگی کے عمومی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تدریس ،تصنیف اور تحریک تینوں کو موضوع بنایا ،اور ہر میدان میں فائق وممتاز رہے ،بظاہر ان تینوں پہلوؤں کو جمع کرنا آسان نہیں ہوتا ہے ،کیونکہ اس میں انتظامی صلاحیت کی بھی ضرورت پڑتی ہے ہے اور علمی اشتغال اور عوامی خدمت کی بھی ،لیکن مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ان کو بحسن وخوبی جمع کیا ،اور قابل فخر کارنامے انجام دئے ،اس طرح آپ کی شخصیت عہد ساز اور تاریخ ساز قرار پائی۔

(۱) تدریس: فرنگی محل کا خاندان علمی اور تعلیمی شروع ہی سے رہا ہے ،جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین نے پوری زندگی تعلیم وتربیت میں گذاری اور ایک لمحہ اس سے چشم پوشی نہیں کی ،یہاں تک کہ ملا نظام الدینؒ نے محسوس کیا کہ طلبائے علوم اسلامیہ کا ایک نصاب تعلیم ہونا چاہئے ،جس کو پڑھ کر وہ خدمت دین کے لائق ہو سکیں ، چنانچہ انہوں نے درس نظامی کے نام سے ایک جامع نصاب مرتب کیا ،وہ برصغیر میں مقبول عام ہونے کے ساتھ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی رائج ہے ،اور اب بھی اس کی افادیت اور ضرورت باقی ہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اسی نصاب کو پڑھا اور زبان وادب میں مہارت پیدا کیا ،نیز علوم اسلامیہ میں کمال پیدا کیا ،پڑھنے کے زمانہ ہی سے تدریس کا سلسلہ

شروع کردیا، علمائے فرنگی محلی کے مصنف حضرت مولانا مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں:

''زمانہ تحصیل ہی سے مولانا نے تدریس کا سلسلہ جاری فرمادیا تھا، ہم لوگوں کے اسباق اس زمانے میں ہوتے تھے، جب مولانا حمداللہ اور شمس بازغہ پڑھتے تھے، اس زمانے میں ملاحسن اور دیگر کتب مطولہ کا بھی مولانا درس دیتے تھے، ایک مرتبہ استاذالوقت نے آپ کے پاس ایک طالب علم کوصدرا پڑھانے کوبھیجا، مولانا نے اس وقت تک صدرا شروع نہیں کیا تھا، مولانا کو تعجب ہوا، اور فرمایا کہ کل سے آیئے گا، اس دن سبق کے وقت جو عصر کے بعد ہوتا تھا، مولانا نے اپنے استاذ سے عرض کیا کہ آپ نے صدرا پڑھانے کے واسطے میرے پاس ایک طالب علم بھیجا ہے، میں نے تو ابھی یہ پڑھا بھی نہیں ہے، استاذالوقت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مجھ کو معلوم ہے مگر تم پڑھاؤ، ان شاء اللہ اچھی طرح پڑھاؤ گے، تکمیل کے بعد اسباق کی بہت کثرت ہوگئی تھی، نماز فجر سے لے کر دس بجے تک اور ظہر کے بعد سے عصر تک اور اکثر اوقات شب کو بھی تدریس کا سلسلہ ہوتا تھا، بعض بعض زمانے میں پندرہ اسباق روزانہ کی نوبت آجاتی تھی، مولانا کی عادت تھی کہ شب کو تدریس کی کتابوں کا مطالعہ ضرور فرماتے تھے، کتابیں مطالعہ فرمانے میں اس درجہ مستغرق ہوتے کہ بعض اوقات دو اور تین بھی رات کے بج جاتے اور مولانا کتاب دیکھا کرتے، ایک پلنگ لکڑی کا بنوایا تھا اس پر چمڑے کا نہایت سخت تکیہ رکھ کر بلا بچھونے کے لیٹتے اور سرہانے روشنی رکھ کر کتاب دیکھنا شروع کرتے، اکثر فرماتے کہ اس طریقہ سے نیند کم آتی ہے، اور اگر آنکھ لگ جاتی تو جلد کھل جاتی ہے، اس زمانہ میں دوپہر کو کبھی قیلولہ نہیں فرماتے، بلکہ مطالعہ کتب میں مصروف رہتے اور استفتوں کے جواب تحریر فرماتے۔'' (علمائے فرنگی محل: ۱۷۱۔۱۷۲)

ان کی تدریسی خدمات کے دائرہ میں مدرسہ نظامیہ کا قیام بھی ہے، یہ مدرسہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا عظیم کارنامہ ہے، وہ صرف ایک مدرسہ نہیں تھا، بلکہ ایک تربیت گاہ

تھی، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے تھے، اس کے ذریعہ بے شمار افراد فارغ ہوکر علوم اسلامیہ کی خدمت میں مشغول ہو چکے ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''دوسری طرف فرنگی محل میں ایک باقاعدہ مدرسہ عربیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو باقاعدہ مدرسہ بنایا، جس سے متعدد اصحاب فکر اور اہل قلم پیدا ہوئے''۔

(۲) تصنیف: مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے تصنیف کے میدان میں بھی قابل قدر کام انجام دیا، ان کی تصنیفات کی مختلف قسمیں ہیں، کچھ درسی کتابوں پر حاشیے سے متعلق ہیں، تو کچھ تحقیق وتعلیق سے متعلق ہیں، کچھ نصابیات سے متعلق ہیں، اور کچھ مستقل تصانیف ہیں، ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات ایک سو دس تک پہونچتی ہیں:

علم صرف میں دس کتابیں ہیں: تحفۃ الاخوان ۔ ہدیۃ الخلان ۔ المنتخب ۔ سلسلۃ الذھب ۔ تسہیل الصرف ۔ جامع الفوائد ۔ ارتقاء الشرف ۔ مقدمۃ الصرف ۔ شرح ہدایۃ الصّف ۔ شرح فصول اکبری۔

علم نحو میں سات کتابیں ہیں: نور الصباح شرح المصباح ۔ ہدیۃ الطلبہ، شرح ہدایۃ النحو، حاشیہ الفیہ ۔ تحفۃ الاصحاب ۔ عین الصواب ۔ حاشیہ النافعۃ علی طفرۃ الزاویۃ ۔

فن حکمت میں ایک کتاب ہے: رسا لة فى الهيئة القديمة والجديدة.

فن منطق میں تین کتابیں ہیں: اعتصام الأذهان، شرحان لايساغوجى، تقريب الأذهان.

فن فقہ میں ۳۲ کتابیں ہیں: الانصاف فى الأوقاف۔ الدرر الفاخرة للذرية الطاهرة ۔ العمل المغفور ۔ رحمة الغفور ۔ خير الزاد ۔ الفيض الرحمانى ۔ قرة العين ۔ حياة أولى الألباب ۔ الحظر ۔ رساله فى تحقيق الجزيه ۔ احقاق السماع ۔احسن القربات ۔ رجم الشيطان ۔ غاية

المأمول ـ القول المؤيد ـ كشف الحال ـ طعن السنا ن ـ التعليق المختار ـ رسالة فى مسائل الطهارة ـ ذب الطاعنين ـ خير الدعاء ـ الحرز المصون ـ رحمة الأمة ـ صرع الجان ـ فتاوى قيام الملة والدين ـ تعليق الأزهار ـ البيان المسلم فى ترجمة الكلام المبرم فى نقض القول المحكم ـ العمل الماجور بترجمة المبرور فى رد القول المنصور ـ الحج المغفور بترجمة السعى المشكور فى رد المذهب المأثور ـ محاسن جميله ـ سوق الإيمان ـ رسائل متعلقه بقرء الإصلاح.

فن فرائض میں تین کتابیں ہیں:

كتاب الفرائض ـ حاشيه سراجية ـ الإظهار فى توريث الاماء والأصهار.

فن کلام میں چار کتابیں ہیں:

غاية الكلام ـ زبدة الفرائد ـ كتاب العقائد ـ سائنس وكلام

فن اصول فقہ میں تین کتابیں ہیں:

ملهم الملكوت شرح مسلم الثبوت ـ نهاية الانكشاف فى رواية الاختلاف ـ اعجاز الابصار شرح المنار.

فن حدیث میں ۱۳ رکتابیں ہیں:

الآثار المحمدية ـ الآ ثار المتصلة ـ الدرة الباهرة فى الأحاديث المتواترة ـ شفاء الصدور ـ راحة الفؤاد ـ الارشاد فى الاسناد ـ الباقيات الصالحات ـ الهياكل المعنوية فى الشمائل النبوية ـ أربعين حديث (تين عدد)، آثار الامامة ـ الأربعين الزاجرة فى الحوادث الحاضره ـ المذهب المؤيد بما ذهب إلى أحمد ـ هدية الطيبة لصلة ابن أبى شيبة ـ الذب عن أبى حنيفة بما طعن به ابن قتيبة ـ

فن تفسیر میں سات کتابیں ہیں:

تنویر الصحیفۃ ، شھادۃ الحسین ۔تنشیط المحبین ۔ رسالہ فی الوفاۃ ۔تحفۃ الأخلاء، جلاء الأبصار۔الھدیۃ المنیفۃ ۔الرحلۃ الوافیۃ ،الرحلۃ الحجازیۃ ۔حسرۃ المستر شد بوصال المرشد ۔عرس حضرت بانسہ،ملفوظ حضرت سید السادات ۔مقدمۃ التعلیق المختار علی کتاب الآثار۔ تسھیل المنہج فی أسماء رجال کتاب الحج،مقدمہ حاشیہ سیر صغیر وسیر کبیر۔

تصوف وسلوک میں آٹھ کتابیں ہیں:

افضل الشمائل ۔سبیل الرشاد ۔ رسالہ النصیحۃ ۔ رسالہ التوبہ ۔نظم الفرائد ۔محاسن یوسفی ۔حاشیہ فصوص الحکم ۔رسالہ اذکار واشغال۔

فن ادب میں دو کتابیں ہیں:

حاشیہ حماسہ اور شرح قصیدۂ بردہ۔

اس کے علاوہ درسی کتابوں پر حواشی ہیں، جو غیر معمولی افادیت کے حامل ہیں۔

(۳) تحریک: مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے تدریس ،تصنیف کے ساتھ تحریکی سرگرمیوں میں پرزور حصہ لیا، ایک طرف انہوں تحریک آزادئ ہند میں غیر معمولی دلچسپی لی، اوراس کو متحرک کیا، جمعیۃ علماء ہند کے قیام میں پیش پیش رہے، خدام کعبہ، خلافت کمیٹی وغیرہ بھی آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔

چند باکمال علماء کے تأثرات:

علامہ حکیم عبدالحی حسنیؒ الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الأعلام میں لکھتے ہیں:

> ’’مولانا عبد الباری فرنگی محلی ایک متحرک و فعال آدمی تھے ، انہیں علمی اداروں، تعلیمی منصوبوں کی تکمیل سے خاصا شغف تھا، عوام سے ان کے روابط مستحکم تھے ، مسلمانوں کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی ، سیاسی

تحریکات سے ان کی دلچسپی بڑھی ہوئی تھی ، وہ تحریک خلافت کے پر جوش رہنماؤں میں تھے اور خلافت عثمانیہ کے حامیوں میں آپ کا نام سرفہرست تھا اسی وجہ سے آپ لوگوں کو اس کی ہر ممکن تائید کرنے پر ابھارتے اور اس کے لئے امداد وتعاون جمع فرماتے ، جلسوں کا اہتمام کرتے ، اور اس کے لئے دور دراز علاقوں ، شہروں اور ریاستوں کا سفر کرتے ، انگریزوں سے آپ کی عداوت اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ وہ ان کے حریف مقابل کی حیثیت سے مشہور تھے۔'' (ج ۸/۲۳۰)

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے انتقال پر معارف میں جو شذرہ لکھا اس کا ایک اقتباس نذر قارئین ہے:

''فرنگی محل کے متأخرین میں حضرت استاذ استاذی مولانا عبدالحی کے بعد مولانا عبدالباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی ، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایات کی حامل تھی ، ارشاد و ہدایت ، وعظ ونصیحت ، درس وتدریس ، تلاش و مطالعہ ، تحریر وتألیف ان کے روزانہ کے مشاغل تھے ، ان دینی وعلمی مناقب کے ساتھ دین وملت کی راہ میں ان کا جانفروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہمرنگ شہدا تھا ، ذاتی اخلاق ، وجود وسخا ، تواضع وانکسار ، علم کی عزت ، صداقت ، حق گوئی ان کے اوصاف گرانمایہ تھے ، ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی ، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جد وجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا انہیں کا کارنامہ شمار کیا جائے گا ، اس لئے ان کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں ، بلکہ اسلام کا سانحہ ہے ، اور بنا بریں ان کی جوانا مرگی ہمیشہ کے لئے تاریخ اسلام ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا۔ شمع بجھ گئی ، مگر اس کے دھوئیں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر ہمیشہ لکھا نظر آئے گا۔

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

دوسری طرف فرنگی محل میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسہ عربیہ کی بنیاد دڈالی ، اوراس کوایک باقاعدہ مدرسہ بنایا ، جس سے متعدد اصحاب فکراوراہل قلم طلبہ پیدا ہوئے۔

انہوں نے اپنے بعداپنی تالیفات وتصنیفات کی فہرست یادگار چھوڑی ہے، وہ فقہ حنفی کے پرجوش حامی تھے،ان کی قلمی وعلمی کوششیں زیادہ تراسی کے متعلق صرف ہوتی رہیں''۔(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا کی شخصیت اپنے زمانہ میں ایک عجیب وغریب بابرکت ونفع رساں،صاحب علم وعمل اور جامع ذات گذری ہے،خاندان فرنگی محل پشتہا پشت سے نامور چلا آرہا تھا ، یہ بزم ہستی میں آخر میں آئے ،لیکن بساط عظمت پر جب بیٹھے تو کسی سے ہیٹے رہے نہ پیچھے۔

دین کی خدمت ، پڑھنے پڑھانے کا لکھنے لکھانے کا ورثہ بزرگوں سے ساتھ لائے تھے، اپنی ذات سے یہ سارے جو ہر چمکادیئے ، سیرت و سلوک ،صرف ،نحو،ادب ،منطق ،فقہ،اصول فقہ،کلام مناظرہ ،حدیث و تفسیر خدا جانے کتنے علوم وفنون پر چھوٹی بڑی سو سے اوپر کتابیں تیار کردیں۔''(نشریات ماجد:۱۳۸)

غرض مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ذات مجموعہ کمالات تھی،مختصر عمر میں اس قدر کارناموں کا تسلسل،یہ محض ان کی اخلاص وللّٰہیت،اورعنداللہ مقبولیت کی دلیل ہے۔شاعر نے کہا تھا:

لیس علی اللّٰہ بمستنکر

أن یجمع العالم فی واحد

علامہ سید سلیمان ندویؒ:
بلند پایہ عالم دین، محقق اور سیرت نگار

علامہ سید سلیمان ندویؒ بیسویں صدی کے نہایت بلند پایہ عالم دین، محقق اور سیرت نگار تھے، وہ دین ودنیا کی فکر کے جامع تھے، ان کا شمار اس عصر کی نادرۂ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے، وہ ایک طرف زبردست عالم دین، اسلام کے داعی، مفکر اور محقق وادیب تھے تو دوسری طرف سیاسی بصیرت میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ملی غیرت، حالات حاضرہ پر مبصرانہ اور گہری نظر ان کا طرۂ امتیاز تھا، وہ داعیانہ صفات کے ساتھ قائدانہ صلاحیتوں کے پوری طرح جامع تھے، اوران تمام خصوصیات میں متوازن فکر اور طریقۂ عمل ان کا خاص وصف سمجھا جاتا تھا، وہ تحریک ندوۃ العلماء کے روح رواں، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے قلب وزبان، اوردارالقضاء بھوپال کے رئیس القضاۃ تھے، علمی اور تحقیقی صحافت، زبان وبیان کی مہارت اورادب وانشاء کی لطافت میں ان کا مقام بہت بلند تھا، علم کی پختگی، مطالعہ کی وسعت اور کتاب وسنت پر گہری نظر کے ساتھ ورع وتقوی، تواضع اور کسر نفسی اور تعلق باللہ کا ایک حسین امتزاج ان کی زندگی میں موجود تھا، سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابل ذکر وصف ان کی یہی جامعیت ہے، جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سید صاحب پر اپنے تأثرات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

> ''سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت ہے اوران کے علوم ومضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اوران کی علمی زندگی میں قدیم وجدید کی واقفیت، علمی تبحر اورادبی ذوق، نقادومؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء وانشاء پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اورفکر ونظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہوگئی تھی جو شاذونادر جمع ہوتی ہے۔''

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۰۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور پانچ سال احاطۂ دار العلوم میں رہ کر سند فراغت حاصل کی، ندوہ میں آپ کے اساتذہ میں مفتی عبد اللطیف سنبھلیؒ، سید علی زینبیؒ، مولانا شبلی فقیہ جیراجپوریؒ، مولانا حفیظ اللہ اعظمیؒ، مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ اور مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ قابل ذکر ہیں، ۱۹۰۷ء میں ندوہ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہِ عام کلب لکھنؤ میں منعقد ہوا، اس میں سید صاحب نے ''علوم قدیم وجدید کے موازنہ'' پر اردو میں تقریر کی، پھر حاضرین کے مطالبہ پر عربی میں بھی برجستہ تقریر کی، جس سے لوگوں پر خاص اثر ہوا، خواجہ غلام الثقلین جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے امتحاناً سید صاحب کے لئے ایک موضوع: ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہو؟'' منتخب کیا، سید صاحب نے بلا کسی توقف کے عربی میں ایسی مؤثر تقریر کی کہ اَحسنت اور آفریں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، ۱۹۰۶ء میں فارغ ہوتے ہی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریض پر ''الندوہ'' کی سب ایڈیٹری ان کے سپرد کی گئی، اور متعدد علمی وتحقیقی موضوعات پر مضامین لکھے، سید صاحب نے ۱۹۰۵ء میں ''علم حدیث'' کے موضوع پر ایک ایسا مؤثر مضمون لکھا جو بہت مقبول ہوا، ۱۹۰۸ء میں حضرت سید صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، اور ضرورت کے پیش نظر ''دروس الأدب'' کے نام سے عربی کی دو ریڈریں مرتب کیں، جو بیشتر مدارس کے نصاب تعلیم کا جزء ہیں، ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے نئے الفاظ کی ڈکشنری تیار کی جائے، چنانچہ سید صاحب نے دو برس کی جہد مسلسل کے بعد ''لغات جدیدہ'' کے نام سے ایک ڈکشنری تیار کی، اور وہ بھی مقبول خاص وعام ہوئی۔

سید سلیمان ندویؒ کا تعلق اگرچہ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء سے ضابطہ کا نہیں رہا، لیکن انہیں کلکتہ، پونا، اعظم گڑھ، بھوپال اور پاکستان کے دوران قیام اس کی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی رہی، اور برابر ندوۃ العلماء کے احوال وکوائف سے واقف ہوکر مفید مشوروں سے نوازتے رہے، مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد جب نواب علی حسن خاں صاحب کو ۲؍فروری ۱۹۲۳ء میں بحیثیت ناظم منتخب کیا گیا تو سید صاحب کو معتمد تعلیم کا

عہدہ ملا، اورتاوفات ۱۹۵۳ء اسی عہدہ پرقائم رہ کرندوۃ العلماء کی خدمت انجام دیتے رہے۔

سید صاحب کوندوہ سے نہایت گہرااورروحانی تعلق تھا، وہ دل وجان سے ندوہ کی خدمت اوراس کی فکرکوعام کرنے اوردنیاکے گوشے گوشے میں پہونچانے کی سعی پیہم میں مشغول تھے، وہ دارالعلوم کے طلباء کوجس علمی اورفکری بلندی پرلے جاناچاہتے تھے، اس میں وہ بڑی حدتک کامیاب رہے، اور وہ نہ صرف اپنے شاگردوں بلکہ اس وقت کے تمام علمی حلقوں سے بھی وابستہ تھے، وہ دارالعلوم میں عربی زبان وادب کواہل زبان کی طرح رواج دینے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرتے تھے، وہ اس بات کے قائل نہ تھے کہ ندوہ صرف زبان ہوشمند ہے، بلکہ وہ ندوہ کوایک عظیم المرتبت اورنمونہ کی علمی اورفکری تحریک سمجھتے تھے، جہاں سے عربی زبان و ادب کے سوتے پھوٹیں اورندوہ میں عربی زبان وادب کے ماہرین علماء پیدا ہوں، تاکہ وہ براہ راست کتاب وسنت کی زبان اوراس کے معانی کے نکتہ داں ہوں، اوروہ عربی زبان کوایک زندہ اورمتحرک اورتعبیری صلاحیتوں سے بھرپورزبان سمجھ کرعلوم اسلامیہ کے ماہرین علماء، ادباء، دعاۃ ومفکرین کی حیثیت سے سارے عالم میں متعارف ہوں۔

اسی مقصدکو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ندوہ کواپنی تمناؤں کی اصل آماجگاہ بنایااور زیادہ سے زیادہ قیام کیا، وہ علم وعمل کی جامع علماء کی ایک فوج تیارکرناچاہتے تھے، انہوں نے اپنے اس خواب کوشرمندۂ تعبیرکرنے کے لئے معتمدتعلیم کا عہدہ قبول فرمایا، اورفکروعقیدہ کی گہرائی اورعلم وعمل کی جامعیت، زبان وادب کے امتزاج سے ندوہ کوایک صحیح اور بامقصدسمت عطاکی، اورندوہ کے بارے میں اہل علم کے طبقہ میں حسن ظن پیدا کرنے کے نقطہ پراپنی توجہات کومرکوز کیا، اورعلماء ودانشوران قوم کے طبقہ میں ندوہ کی ضرورت اوراس کی افادیت کا یقین پیدا کرنے کی بھرپورکوشش کی، اورتاسیس ندوہ کے ابتدائی سالوں میں اس کومتہم کرنے اوراس کے فضلاء کوملحدوبے دین قراردینے کا جوفیشن چل پڑاتھا، اس میں بہت حدتک کمی آئی۔

سید صاحب اپنے پاکستان ہجرت کرنے کے بعدبھی ندوہ سے اسی طرح منسلک اوراس کو شجرپھل داربنانے کی کوششوں میں مصروف رہے، وہاں کے علماءاورعامۃ المسلمین کوندوہ کی حقیقت سے آگاہ کیا، اوراپنی عظیم شخصیت کے بہترین علمی اورفکری نقوش چھوڑکردنیا سے

رخصت ہوکر آخرت کی راہ لی، اور تاحیات معتمد تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے، اپنی وفات سے کچھ ہی دن پہلے مشرقی پاکستان سے واپس ہوتے ہوئے ندوہ تشریف لائے اور کئی دن تک ندوہ میں قیام فرمایا، افسوس کہ اس زمانہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان تشریف لے گئے تھے، سید صاحب کو افسوس رہا کہ ملاقات نہ ہوسکی، اور یہ مصرعہ دہرایا: ؏

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا

اس وقت کے ندوہ کے ذمہ دار حضرات نے خاص طور سے حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے سید صاحب کے استقبال میں ایک جلسہ مسجد دارالعلوم میں منعقد کیا، اس میں سید صاحب نے طلباء اور اساتذہ سبھی حضرات کو حال و مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی میں تعمق پیدا کریں، اور اس کے ترجمان بننے کی کوشش کریں، تاکہ ہم اللہ کی شریعت کا جیتا جاگتا نمونہ اپنی زندگیوں میں لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
دنیائے علم وتحقیق کی مایہ ناز شخصیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی بیسویں صدی عیسوی کی مایہ ناز شخصیات میں تھے، وہ درس وتدریس، تحقیق وتصنیف، تقریر وخطابت کے میدان میں اپنی شناخت رکھتے تھے، ان کا انداز نگارش انوکھا، اور منطق وفلسفہ کی ژولیدہ بیانیوں سے پاک تھا، وہ علم وتحقیق کے ساتھ لکھتے اور خوب لکھتے، ان کی زبان ادب وبلاغت کی چاشنی اور فصاحت کلام کی حلاوت سے لبریز تھی، ان کا مطالعہ تازہ اور معلومات مستحکم تھیں، اور بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی: ''بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے''۔ انہوں نے ایک طرف سیرت وسوانح پر لکھا، جس میں ایک طرف ''النبی الخاتم'' اپنے البیلے انداز اور پرکشش جملوں کی وجہ سے ممتاز ہے، تو دوسری طرف تاریخ کی پر پیچ راہوں کو بھی عبور کیا، جس میں ''تاریخ تدوین قرآن''، و''تدوین حدیث'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح دوسرے فنون میں وہ اپنے قلم کی جولانی، اور متانت اسلوب کی وجہ سے فوقیت لے گئے۔

مولانا گیلانی کا وطن صوبہ بہار کے ایک گاؤں ''گیلانی'' ہے، اس کا تذکرہ وہ خود اپنی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں اس طرح کرتے ہیں: ''یہ گیلانی وہی گیلانی ہے، جس کی طرف خاک سارا اپنے نام کی اضافت کرتا ہے، فقیر کا مولد ومنشأ بہار کا یہی گاؤں ہے،'' انہوں نے ۱۸۹۲ء میں آنکھیں کھولیں، آپ کے دادا

حضرت مولانا محمد احسنؒ اپنے وقت کے جید عالم تھے، اورآپ کے والد حافظ ابوالخیر تھے ،مولانا گیلانی وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے راجستھان کے شہر ٹونک گئے، اور علوم اسلامیہ کی تحصیل مولانا سید برکات احمد ٹونکی کی زیرنگرانی کی، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، یہاں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے کسب فیض کیا، علوم و فنون کے اس کہکشاں کے درمیان رہ کروہ ''جامع الکمالات'' اور ''منبع فیوض و برکات'' بن گئے، اور بقول مصنف: حیات مولانا گیلانی: ''ماحصل یہ ہے کہ مولانا گیلانی کی طالب علمانہ زندگی کے تین دور ہوئے: پہلا دور گیلانی میں گذرا، جہاں آپ نے ناظرہ قرآن، اردو اور ابتدائی فارسی، اور عربی کی کتابیں پڑھیں، وہاں کے اساتذہ میں صرف مولانا کے محترم چچا مولانا حکیم سید ابوالنصر کا نام بحیثیت استاذ آیا ہے، دوسرا دور طالب علمی کا ٹونک میں گذرا، اور یہ سب سے لمبا زمانہ تھا، تیسرا دور طالب علمی کا دارالعلوم دیوبند میں گذرا، یہاں آپ نے ایک سال رہ کر علم حدیث کی تکمیل کی'' (۹۰۔۹۱)

مولانا کی عملی زندگی میں تدریس کا حصہ زیادہ ہے، وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایک عرصہ تک شعبہ دینیات کے صدر رہے، وہ کچھ سال ٹونک میں رہے، پھر حیدرآباد گئے، اور وہیں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۹ء تک تدریس کا فریضہ انجام دیا، اور شعبہ دینیات کی صدارت کی۔ اگرچہ درمیان میں کچھ مہینوں کے لئے دارالعلوم دیوبند میں القاسم اور الرشید کی ادارت کے ساتھ تدریسی خدمت بھی انجام دی، جب حیدرآباد میں مستقل قیام ہوا اور وہاں مستعدی کے ساتھ اپنے کام انجام دینے لگے تو حیدرآباد میں دارالعلوم کی ترجمانی کے لئے رکن شوری کی حیثیت سے ۱۹۳۰ء میں آپ کا انتخاب ہوا، اور بیس سال تک یہ سلسلہ قائم رہا۔اس درمیان دوسری علمی مصروفیات رہیں، بے شمار مجلّات اور رسائل میں تحقیقی مضامین لکھے، اور کتابیں تصنیف کیں، اور بالآخر ۵ / جون ۱۹۵۶ء میں رفیق اعلی سے

جا ملے۔آپ کے انتقال پر بے شمار اہل قلم نے مضامین لکھے اور منظوم تأثرات کا اظہار کیا۔

مولانا گیلانیؒ کی اہم تصنیفات اور مقالات:

(۱) مقالات احسانی (۲) تدوین حدیث (۳) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (۴) تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ (۵) امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی (۶) سوانح قاسمی (اول، دوم، سوم) (۷) النبی الخاتم (۸) ابوذر غفاری (۹) مجدد الف ثانی (۱۰) بابا رتن ہندی (۱۱) اسلامی معاشیات (۱۲) احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن (۱۳) مکاتیب گیلانی (۱۴) تدوین قرآن (۱۵) اور بے شمار مقالات جو معارف اعظم گڑھ، الفرقان لکھنؤ، برہان دہلی، صدق، صدق جدید، سچ لکھنؤ، القاسم دیوبند، الرشید دیوبند میں شائع ہوئے۔

مولانا گیلانیؒ کے تین امتیازی پہلو:

(۱) تصنیف وتحقیق:

مولانا گیلانیؒ نے تصنیف وتحقیق کا آغاز دار العلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی سے کیا ،جب وہ دورۂ حدیث میں تھے،سب سے پہلے مضمون نویسی کے لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے فرمائش کی ،آپ کا پہلا مضمون ''خیر الأمم کا طغرائے امتیاز'' کے نام سے القاسم دیوبند میں شائع ہوا، اس کے بعد تسلسل سے مضامین شائع ہوتے رہے، یہاں تک علامہ سید سلیمان ندوی نے ان کو''سلطان القلم'' کا خطاب دیا (حیات گیلانی ص:۱۹۸)،مشہور ادیب اور صحافی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ آپ کے اسلوب تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا گیلانی کو حاصل تھا اس سے ناظرین صدق ناآشنا نہیں، ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے، اس میں کسی کے مقلد نہیں، خود اس کے موجد تھے، تحریر کا سب بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی، جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا، بس لکھتے ہی چلے گئے، جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے، ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگا دیتے، خشکی ان کا قلم

جانتا ہی نہ تھا، تحریر کی سطر سطر جاندار تھی۔'' (وفیات ماجدی: ۷۷)۔

استاذ محترم حضرت مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی مولانا کی تصنیفی خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

(۱) قلم برداشتہ لکھنا (۲) تحریر میں جاذبیت (۳) خشک نگاری سے پرہیز (۴) تصلب وتقشّف سے اجتناب (۵) وسعت معلومات اور رسوخ فی العلم (۶) مؤرخانہ ذہن (۷) وغیرہ۔ (حیات گیلانی: ۱۹۱۔۲۱۶)

تقریر وخطابت:

تقریر وخطابت میں بھی مولانا گیلانی کو کمال حاصل تھا، اور'' آپ کی تقریر اکثر وبیشتر تحریر سے کہیں زیادہ دل نشیں، ہلچل پیدا کرنے والی، اور دلوں کو گرمانے والی ہوتی تھی، پرسوز بھی ہوتی تھی، اور جاں گداز بھی، پڑھا لکھا طبقہ بھی متأثر ہوتا تھا، اور عوام کا جاہل طبقہ بھی، عام طور پر مجمع اشک بار ہوتا، اور کبھی کبھی چیخ وپکار کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں''۔

مولانا گیلانی کی تقریر کی ابتدا ٹونک کے زمانہ قیام سے ہوئی، جب وہ وہاں زیر تعلیم تھے، دارالعلوم دیوبند میں جب معین مدرس مقرر ہوئے تو اس وقت بھی ضرورت کے لحاظ سے آپ کو وعظ وخطابت کے لئے جانا ہوتا تھا، عام جلسوں کے ساتھ سیمناروں میں بہت مرتب گفتگو کرتے تھے، حضرت مولانا عبدالباری ندوی مولانا گیلانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' کالج کے فرائض منصبی کے روزانہ کئی کئی لکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل سے مولانا کی صحت پر آخر ایسی بن آئی کہ شب وروز اس نیاز مند کے لئے دیکھتے رہنا برداشت سے باہر ہوگیا'' (مکاتیب گیلانی)۔

تدریس وتربیت:

تدریسی زندگی کا آغاز مدرسہ خلیلیہ ٹونک سے ہوا، پھر دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا

موقع ملا، اوراخیر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں تقریباتیس سال اس منصب پر فائز رہے، تدریس کے زمانے میں آپ صرف معلم نہیں تھے، بلکہ مربی کی حیثیت سے طلباء کی فکر کرتے تھے، وہ اگر چہ قدیم نصاب تعلیم کے فارغ التحصیل تھے، لیکن ان کے اندر جدید تقاضوں کو پورا کرنے کا پورا شعور تھا، مولانا نے حیدرآباد کے زمانہ تدریس میں محسوس کیا کہ کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کے لئے اگر اقامت خانوں کا نظام رہے تو ان کی تربیت میں آسانی ہوگی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ مولانا نے اس نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاندِ اسلام ذہن اور نفاق ہے، جس نے تمام اسلامی ممالک کو الحاد وزندقہ کے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، اور ایک سخت ذہنی کشمکش، بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا، مولانا کی بڑی دینی بصیرت تھی کہ انہوں نے اسلامی ''اقامت خانوں'' کی تجویز پیش کی،، جو کم ازکم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک علمی اور معقول حل ہے''۔
>
> (پرانے چراغ: ج۱/۶۰)

مایہ ناز شخصیت کی دوسری جہات:

مولانا گیلانی نے علم وتحقیق سے معمور زندگی گذاری، فہم قرآن کے تعلق سے ان کے نکات آج بھی اہل علم کے لئے لائق استفادہ ہیں، انہوں نے سورۂ کہف کی تفسیر نئے انداز میں کی ہے، حدیث کی تدوین پر جامع کتاب لکھی، جو آج تک محققین کے لئے سرمۂ چشم ہے، شعروشاعری کا بھی ذوق تھا، چاروں زبانوں (اردو، ہندی، فارسی، عربی) پر شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے، آپ کے اشعار واردات قلبی کا ترجمان ہیں، ان کی مشہور نعت مگھی زبان میں آج بھی اہل علم کی زبانوں پر ہے، اس کا مطلع ہے:

پیارے محمد جگ کے سجن　　　تم پر اُوروں تن من دھن

تمری صورتیا من موہن   کبھیو کر لو ہو تو درشن
جیا کٹھرے دلوا ترسے
کر پا کے بدرا کہیا برسے
تمہری دوریا کیسے چھوڑوں   تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں   تمری نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

اسی طرح تصوف وسلوک اور تزکیہ باطن پر توجہ دیتے تھے، اور حضرت تھانوی کے مکتب فکر سے متأثر تھے، یہ اور اسی طرح کے دوسرے پہلو ہیں جو ان کی زندگی میں نمایاں ہیں، اور ان کو شخصیت کی عبقریت کو واضح کرتی ہیں۔

مولانا گیلانی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی آمد:

مولانا گیلانیؒ چونکہ ندوۃ العلماء کے سابق ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی سے دوستانہ تعلق رکھتے تھے، اور ان کا علاج بھی کرتے تھے، اس لئے وقتاً فوقتاً حیدرآباد واپسی سے لکھنؤ ہو کر جاتے تھے، مولانا عبدالباری ندویؒ کے یہاں ان کا قیام رہتا تھا، اور ایک دو روز لکھنؤ میں رکتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، اور استفادہ کا موقع ملتا تھا، اور بقول حضرت مولانا: ''مولانا گیلانی نے مشفقانہ ومربیانہ اور میں نے شاگردانہ ونیازمندانہ تعلق آخر تک رکھا''، حضرت مولانا نے اس سے مراسلت بھی رکھی ،جس کے نمونے اپنی کتاب پرانے چراغ جلد اول میں ہیں اور اخیر تک یہ سلسلہ قائم رہا، ایک مرتبہ اپنی زندگی کے آخری دور (انیس سو پچاس عیسوی کے دہے میں) وہ آئے تو مرکز دعوت وتبلیغ امین آباد میں مختصر قیام رہا، اس وقت ہم کو بھی ان کی زیارت کرنے اور قریب سے ان کے افکار کو سننے کا موقع ملا، وہ اگر چہ قدیم نظام تعلیم کے تعلیم یافتہ تھے، لیکن زمانے تقاضوں کو نظر

اندازکرناان کے لئےکسی طرح ممکن نہ تھا۔وہ بلاشبہ ندوی الفکراورندوی القلم تھے۔

ایک یادگارواقعہ:

غالبا اگست ۱۹۵۳ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ مشرقی پاکستان کے سفر سے واپسی میں دارالعلوم تشریف لائے تھے اور مہمان خانہ میں قیام فرمایا تھا، اس موقع پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ وطلباء نے ایام قیام میں سید صاحب کی خدمت میں بابار حاضر ہو کران کے دیدار اوران کے کمالات عالیہ سے استفادہ کیا، میں تخصص ادب کے دوسرے سال میں تھا، اور سید صاحب رحمہ اللہ کو دیکھنے اوران کے افادات سے مستفید ہونے کی کوشش میں برابراپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک رہا۔

اس وقت دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے سید صاحب کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، اور ہمہ وقت سید صاحب کے آرام وراحت کا خاص خیال رکھا، اس زمانے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) پاکستان کے سفر پر تھے، اور جب سید صاحب نے دارالعلوم کی وسیع مسجد میں جملہ اساتذہ وطلبہ کے مجمع میں تقریر فرمائی، تو سب سے پہلے حضرت مفکر اسلام سے ملاقات نہ ہونے افسوس ظاہر کرتے ہوئے یہ مصرع پڑھا:

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

سید صاحب کی ہندوستان سے واپسی کے بعد مختصر مدت کے بعد ماہ نومبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ خبر صاعقہ اثر بن کراہل ندوہ پر گری، اور حضرت مولانا نے جلسۂ تعزیت میں اپنے تأثرات بیان فرمائے، اور حضرت سید صاحب پر ایک علمی اجتماع دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد کرنے کا فیصلہ فرمایا، اوراس اجتماع میں سید صاحب کے دیرینہ رفیق اور ان سے انتہائی مخلصانہ تعلق رکھنے والے حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب کوشرکت کی

دعوت دی، اس دعوت نامہ میں سید صاحب مرحوم اور مولانا گیلانی کے باہمی تعلق وارتباط کا ذکر کر کے اس سنجیدہ علمی اجتماع میں جو سید صاحب کی یادگار کے طور پر منعقد ہونے والا تھا، تشریف لانے کی درخواست کی، اور مولانا گیلانی نے اپنی علالت اور ضعف صحت کے باوجود اس اجتماع میں شرکت کرنے کو اپنی سعادت قرار دیا، اور تشریف آوری ہوئی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا گیلانی صاحب کے اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف آوری کا ذکر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا اپنے برادر عزیز مولوی مکارم احسن صاحب کی معیت میں تشریف لائے، اور نہایت ذوق وشوق اور محبت وخلوص کے ساتھ دوروزہ اجتماع میں شرکت فرمائی، ایک روز کے اجتماع کی صدارت بھی فرمائی، اپنا مقالہ (جو حسب معمول طویل، دلچسپ اور پر مغز تھا) سنایا، مقالہ سیرۃ النبی کے حصہ ششم پر ایک مفصل تبصرہ تھا، اس میں دکھایا گیا تھا کہ سید صاحب نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاق نبوی پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر منفرد چیز ہے، اور سید صاحب کے علمی کارناموں میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے، اس مضمون میں انہوں نے جس فراخ دلی، فیاضی اور مسرت کے ساتھ اپنے معاصر کے علمی وتصنیفی مقام اور اس کی عظمت کا اعتراف کیا تھا، وہ خود مولانا کی عظمت کی دلیل اور ان کی بے نفسی وخلوص کا روشن ثبوت تھا، اور علمائے سلف کی یاد تازہ کرتا تھا، مولانا نے میری فرمائش پر اپنی وہ نظم بھی سنائی، جو انہوں نے واقعہ کی اطلاع سن کر لکھی تھی، اور بعض اخبارات میں چھپ چکی تھی، جس وقت مولانا نے اپنی پر اثر آواز میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ نظم سنائی تو سماں بندھ گیا، اور بہت سی آنکھیں نم تھیں، اجتماع کے علاوہ جو اوقات ملتے تھے وہ مولانا کی پر بہار مجلس کے لئے وقف تھے، اساتذہ وطلباء کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد رہتا اور حالت یہ تھی کہ:

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اجتماع سے فارغ ہوکر اور مولانا عبدالباری صاحب کے یہاں کچھ وقت گزار کر وہ ہمارے مرکز میں تشریف لے آئے ، میں نے ایک روز ان سے ان نعتوں کے سنانے کی فرمائش کی جو انہوں نے بہاری ہندی میں لکھی ہیں، اور جو سوامی دھرجی گیلانی والے کی طرف سے بعض اخبارات و رسائل میں چھپی ہیں، ان نعتوں میں ان کی محبت، سوز اور بارگاہ نبوی سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہوگیا ہے، ہندی کے میٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع ان سب نے مل کر اس میں عجب دلکشی اور دلآویزی پیدا کردی ہے۔ مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے اور سننے والے بھی متأثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے''۔

(پرانے چراغ ج۱/۶۸۔۶۹)

اس علمی اجتماع میں ہم طلباء نے شرکت کے ساتھ حضرت مولانا گیلانی سے کسی حد تک فیض یاب ہونے کی کوشش کی ، اور جب تک ان کا قیام لکھنؤ میں رہا، ان کی خدمت میں برابر حاضری کی سعادت حاصل رہی، خاص طور سے جب وہ مرکز تبلیغ ودعوت میں جہاں حضرت مفکر اسلام رحمہ اللہ علیہ کا قیام تھا، جب تشریف لائے اور اپنی نظم کو پر درد اور مترنم آواز میں سنائی تو ایک سماں بندھ گیا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) اور جب تک مرکز میں قیام فرمایا، یہ عاجز ان کے قافلے کے ساتھ ان کے فیوض سے مستفید ہوتا رہا۔

یہ دراصل سید الطائفہ حضرت سید صاحب (رحمہ اللہ) اور آپ کے محبّ خاص و رفیق مخلص علامہ گیلانی کو پہلی اور آخری بار دیکھنے، سننے اور فیض یاب ہونے کا مجھ کو موقع ملا۔ فالحمد للّٰہ علی ذلك.

اللہ تعالیٰ ان کی شخصیت اور خدمات پر منعقد اس سمینار کو مفید سے مفید تر بنائے اور اس کے فوائد کو عام وتام فرمائے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ:

جامع الکمالات شخصیت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت جامعیت کی شان رکھتی تھی، عظیم مصلح، کامیاب قائد، بے مثال استاذ اور اچھے واعظ اور مصنف تھے، خاندانی خصوصیات کے ساتھ مکارم اخلاق کے اعلی مقام پر فائز ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دست راست، رفیق سفر وحضر اور صاحب سر وجہر رہے، ان کی شفقتوں، دعاؤں اور توجہات سے ایک ولی کامل کی شان رکھتے تھے، جس کی نگاہ اثر سے ہزاروں افراد کی زندگیاں بدلیں۔

ندوۃ العلماء کی قیادت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی امارت کے لئے اس عہد انحطاط میں آپ سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں ہوسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے صائب مشوروں، حکیمانہ فیصلوں سے ملت کی کشتی سلامتی کے ساتھ ساحل مراد سے ہم کنار ہورہی تھی، سمندر کا سا سکوت، زمین جیسا جھکاؤ، پہاڑوں جیسی صلابت اور آسمان جیسی بلندی اور رفعت، آپ کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔

حضرت کی زندگی کا اصل مشن دعوت وتبلیغ اور تعمیر انسانیت ہے، اس کے لئے آپ نے درس وتدریس، وعظ ونصیحت، اور تقریر وتصنیف کو بطور ذریعہ استعمال کیا، آپ چونکہ سامعین اور مخاطبین کی نفسیات سے واقف تھے اور قوموں کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور آپ نے ملکوں کا سفر کرکے ان کے حالات کو قریب سے دیکھا تھا، اس لئے ہر طبقہ سے اس کی سطح کے مطابق گفتگو کرنے کا سلیقہ ہی نہیں، بلکہ اس میں کمال حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ سے جو بھی ملتا تھا وہ آپ کا گرویدہ ہوجاتا تھا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے زمانہ میں یہ معمول تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد حضرت کی عمومی مجالس ہوتی تھیں، ان میں کچھ اساتذہ اور طلبائے دار العلوم شریک ہوتے تھے، ان مجالس سے ان کو حضرت مولانا کے تجربات سننے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا، حضرت مولانا کی وفات کے بعد حضرۃ الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جب ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے تو یہ سلسلہ معمول کے مطابق جاری رہا، اس میں عام اصلاحی باتیں، علمی سوالات کے تشفی بخش حل، ان کی عملی زندگی کے تعمیری عناصر اور ملت کے مسائل میں افراد کی صحیح اور مناسب رہنمائی کے اصول بیان ہوتے تھے، اور یہ ساری باتیں قرآن مجید، حدیث شریف اور تاریخ کی روشنی میں ہوتی ہیں، جن سے سامعین کو خاطر خواہ فائدہ پہونچتا تھا، میں عشاء کے بعد ان مجالس میں بیٹھتا تھا، اس کے علاوہ میں نے ان سے درجہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے ۱۹۵۲ء میں تخصص ادب عربی اول میں ان کا گھنٹہ تھا، درجہ میں ان سے ادبی کتابیں پڑھی، وہ الفاظ و معانی کو حل کرنے کے ساتھ فقہ اللغہ پر بہت زور دیتے تھے، تدریسی دور میں ۱۹۵۴ء سے تا وفات کام کرنے کا موقع ملا، اس درمیان زمانہ کے نشیب و فراز میں ان کی استقامت اور بلند حوصلگی ہمارے لئے قابل نمونہ رہی۔ ناامیدی ان کے یہاں بالکل نہیں پائی جاتی تھی، ہر چیز میں خیر کا پہلو تلاش کرتے اور مثبت رویہ رکھتے تھے، منفی رویہ سے ان کو وحشت ہوتی تھی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بچپن ہی سے مفکر اسلام کے زیر تربیت رہے، اور بعد میں حضرت مولانا کے ذاتی سکریٹری کی حیثیت اختیار کر لی، حضرت مولانا ان کو ہر معاملہ میں شریک رکھتے تھے، سفر و حضر میں رفاقت حاصل تھی، ہند و بیرون ہند کے اسفار میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صرف رفیق سفر ہی نہیں ہوتے تھے، بلکہ جملہ امور و معاملات کے ذمہ دار بھی ہوا کرتے تھے، بہت سے نازک مسائل میں صحیح مشورے عنایت فرماتے تھے، اور حضرت مولانا نہایت انشراح کے ساتھ قبول فرمایا کرتے

تھے، سعودی عرب کا سفر ہو یا مصر وشام کا، ترکی کا سفر ہو یا یورپ وامریکا کا، ہر جگہ آپ کی رہنمائی اور مشورے حضرت مولانا کے لئے انتہائی باعث اطمینان ہوا کرتے تھے، بعض دفعہ کسی طے شدہ معاملہ میں کوئی منفی پہلو نظر آتا تو فوراہی اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے۔

۱۹۵۵ء میں جب حضرت مولانا کی منظوری سے ہمارے رفیق ودوست مولانا سید محمد الحسنی اور ہم نے ایک ماہنامہ عربی رسالہ البعث الاسلامی نکالا تو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے پوری سرپرستی کی، اور مفید مشوروں سے نوازا، اور اس وقت سے تاوفات البعث الاسلامی کو آپ کی سرپرستی اور قلمی تعاون حاصل رہا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں النادی العربی کو زیادہ با مقصد بنانے میں زبردست حصہ لیا، اور اساتذہ دارالعلوم کو النادی کے جلسوں کی سرپرستی کرنے کا مشورہ دیا، اس کی وجہ سے النادی العربی مشق وتربیت کا ایک ادارہ بن کر باعث تقویت ہوا، اسی غرض سے ۱۹۵۹ء میں الرائد نامی پندرہ روزہ ایک رسالہ نکالا، جس میں طلباء کی عربی زبان وادب کی مشق پر زور دیا، بحمد اللہ اس عرصہ میں ہزاروں افراد عربی کے بحر کے شناور بن کر نکلے۔

ندوۃ العلما میں آپ کا عہد نظامت حصولیابیوں کے لحاظ سے بڑا شاندار رہا، تئیس سالہ عرصہ میں ندوۃ العلماء کو بڑی وسعت حاصل ہوا، اس کی فکر کو ہر حلقہ میں پہونچنے کے مواقع ملے، اور کئی نئے شعبے قائم کئے گئے، اور دارالعلوم کے تعلیمی نظام میں استحکام عمل میں آیا، اسی کے ساتھ دینی تعلیمی کونسل اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت بھی آپ نے پوری حکمت ودانائی سے کی، اور مسائل کو اپنی گہری سوچ اور فراست سے حل کیا۔

بلاشبہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اسلاف کا اعلی نمونہ تھے، اور اپنے پیش رو بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر صحیح فکر کی ترسیل میں مصروف تھے کہ قضا وقدر کے فیصلہ کے مطابق داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے۔

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی:
جامع الکمالات شخصیت

جامعہ مفتاح العلوم مئو میں میری از ابتدا تا عالمیت کی تعلیم ہوئی، اس وقت جامعہ مفتاح العلوم میں میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی صحاح ستہ کا درس دیتے تھے، عالمیت سے فراغت کے بعد میری زندگی کا ایک نازک مرحلہ آیا، اور اسی میں میرے لئے صحیح جہت کی تعیین ہوئی، جب میرے والد صاحب نے میرے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا۔ دار العلوم میں داخلہ کے سلسلہ میں نے میرے والد صاحب نے دو خط ارسال کئے: ایک حضرت مولانا علی میاں صاحب کو اور دوسرا حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کو، دونوں بزرگوں نے جو جواب تحریر کئے وہ ہمت افزا تھے۔

خانوادۂ نعمانی سے جامعہ مفتاح العلوم میں تعلیمی مرحلہ ہی سے واقفیت تھی، ماہنامہ الفرقان علمی اور دینی حلقوں میں اپنی ایک شناخت رکھتا تھا، اصلاح وتربیت کا کام اس کے ذریعہ اعلی پیمانہ پر جاری تھا، اس کے مدیر اعلیٰ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ علمی اور عوامی حلقوں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ایک شان رکھتے تھے، اور ان کا علماء ومشائخ سے اچھا رابطہ تھا، چونکہ دار العلوم مئو میں تین سال بغرض تعلیم ان کا قیام رہا، اس لئے حضرت مولانا منظور نعمانی کو اہل مئو اور دار العلوم مئو سے گہرا لگاؤ تھا۔

ابتدائے ۱۹۵۲ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے تخصص ادب اول میں میرا داخلہ ہوا، تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شفقتیں حاصل ہوئی، میں روزانہ عصر کے بعد

مرکز تبلیغ کچہری روڈ امین آباد حاضر ہوتا تو حضرت مولانا کے ساتھ حضرت مولانا منظور نعمانیؒ سے ملاقات ہوتی، اور ان سے ملاقات واستفادہ کا موقع ملتا۔ وہیں حضرت مولانا منظور نعمانی کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سے بھی ملاقات ہوتی، اور سلام و مصافحہ بھی ہوتا، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۸ء میں تعلیمی فراغت حاصل کر چکے تھے، اور لکھنؤ آ کر والد ماجد کے کاموں میں تعاون کر رہے تھے، انہوں نے اسی زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت انجام دی، اور اعزازی طور پر مشکاۃ المصابیح کی تدریس کی ذمہ داری لی، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دراز نہیں ہوا، ۱۹۵۳ء میں الفرقان کی مستقل ادارت کی ذمہ داری ڈالی گئی تو وہ تدریس سے الفرقان کی ادارت کے لئے یکسو ہو گئے۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا قلم بڑا شاداب اور اچھے اسلوب کا حامل تھا، ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر کھل کر اپنی رائے ظاہر کرنا اور مناسب حل پیش کرنا انہیں کا خاصہ تھا، وہ حالات حاضرہ اور ملک میں دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مسکت جواب دیتے، اور حجت تمام کر دیتے۔

مجھے یاد ہے کہ مصر میں قومیت عربیہ کا فتنہ اٹھا، تو اچھے اچھے اہل قلم اس کی زد میں آ گئے، البعث الاسلامی نے اس فتنہ کے تار پود کو بکھیرنے کے لئے اس پر تیشہ چلایا، اور اس فتنہ کا قلع قمع کیا، اس زمانہ میں میرے دوست مولانا محمد الحسنی کے پرجوش فکر انگیز اداریئے پوری دلچسپی اور شوق سے پڑھے گئے، اسی درمیان الفرقان لکھنؤ میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا ایک اداریہ (نگاہ اولین) کے کالم میں..... با محمد ہوشیار کے عنوان سے شائع ہوا، وہ مضمون ایسا ہے کہ اس نے قومیت عربیہ کے علمبرداروں کی چولیں ہلا دیں، وہ اداریہ دراصل مجلۃ الأزہر مصر میں شائع ایک مضمون أمة محمد تتوحد کی تردید میں لکھا گیا تھا، یہ عربی مضمون مشہور مؤرخ اور ادیب احمد حسن زیات نے لکھا تھا، مولانا سنبھلی کے اس اداریہ کو ہر سطح پر پسند کیا گیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس اداریہ کو پڑھنے

کے بعد خود عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اور وہ مضمون صلة مسلمی العجم بالنبی العربی کے عنوان سے ان کی عربی کتاب (الطریق الی المدینۃ) کا حصہ ہے۔ اس مضمون سے مولانا سنبھلی کی جرأت ایمانی اور حق گوئی و بیبا کی کا اندازہ ہوتا ہے، حضرت مولانا نے مضمون کے ترجمہ سے پہلے یہ نوٹ تمہیدی طور پر لکھا ہے : اطلعت علی کلمة الأستاذ عتیق الرحمن السنبهلی فی التعلیق علی مقال الأستاذ أحمد حسن الزیات فی مجلة الأزهر ، الذی أثار استنكار جمییع أصحاب الضمائر والایمان فی العالم الاسلامی وسخطهم ، والكلمة دافقة بالحیاة والقوة، وهی تعرب عن وجهة نظر مسلمی الهند والبلاد العجمية، ومدی ارتباطهم بالمقام النبوی الشريف ، و رأیت من حق هذه الكلمة المؤمنة أن أتولی نقلها و تعریبها لیطلع علیها اخواننا العرب.

(الطریق الی المدینۃ: ۸۵، طبع مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۱۹ء)

مارچ ۱۹۶۲ء میں اردو صحافت کے میدان میں ایک جرأت مندانہ اقدام کیا گیا، اس کا پس منظر یہ تھا کہ ملک کے سیاسی حالات ابتر تھے، فرقہ واریت کا فتنہ جاری تھا، صورت حال کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی اخبار یا رسالہ ہو، جس میں پوری بے باکی سے ملکی سیاست کے رخ کی ترجمانی کی جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دونوں حضرات نے طے کیا کہ ایک ہفت وار رسالہ نکالا جائے، اس کی ادارت کے لئے قرعہ فال مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کے نام نکلا، اور ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ان کے معاون رہے، الحمد للہ مولانا سنبھلی کی ادارت میں یہ رسالہ نکلا، اور اس نے مسلم معاشرہ پر اچھا اثر ڈالا ہے، ۱۹۶۲ء ہی میں میرے کئی مضامین شائع ہوئے، جو تقریباً دس ہیں، میں نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب (۴۸ سال شفقتوں کے سائے میں) کیا ہے۔

کچھ سال کے بعد بعض عوارض کی بنیاد پر مولانا سنبھلی نے لندن میں قیام کو ترجیح

دی،لیکن ان کے علم اور قلم کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی، وہاں کے زمانہ قیام میں بڑی معرکۃ الآراء کتابیں لکھی، جن میں واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر ہے، یہ بھی واضح رہے کہ انہوں نے محفل قرآن کے نام سے تفسیر قرآن کا اچھا سلسلہ شروع کیا تھا، اور اس کی قسطیں ماہنامہ الفرقان میں شائع ہوتی تھیں، اور عوام وخواص کے خاصے استفادے کا ذریعہ تھیں، اب وہ کتابی شکل میں کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں، ان کے بعض مجموعہ مضامین (مجھے ہے حکم اذاں، راستے کی تلاش وغیرہ) بھی مکتبہ الفرقان سے شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا سنبھلی نے اپنے علمی کاموں میں ایک اہم کام (حیات نعمانی) اپنے پیچھے چھوڑا، یہ کتاب سات سو صفحات میں بڑی تقطیع میں الفرقان بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی، اس کی تقریب رسم اجراء کی تقریب لکھنؤ کے ایک میدان نزد سفید بارہ دری میں رکھی گئی، اور بڑے اہتمام سے اس کی رسم اجراء کی تقریب منعقد ہوئی، اس تقریب میں عمائدین شہر لکھنو کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور ملک کے بڑے علماء مدعو تھے، لیکن مولانا سنبھلی کی محبت وخورد نوازی کہ انہوں نے اس اجلاس کی صدارت کے لئے مجھ ناچیز کے نام پر اتفاق کیا ہے، بحمداللہ پروگرام منعقد ہوا، اور پوری شان وبان اور گہرے اثرات کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا تازہ ترین حادثہ وفات عالم اسلام کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا، اس حادثہ کو ندوۃ العلماء اور اس کے تمام ملحقہ اداروں میں ایک اہم ترین حادثہ کے طور پر محسوس کیا گیا، مسجد ندوۃ العلماء میں ان کے لئے دعائے مغفرت کی گئی، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم نے جہاں ایک طرف ان کے برادران کو تعزیتی خط لکھا، وہیں دوسری طرف البعث الاسلامی کے لئے عربی میں ایک مضمون املاء کرایا، جو مارچ ۲۰۲۲ء میں شائع ہوا۔

اللہ تعالیٰ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی بال بال مغفرت فرمائے، اور ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ:

سرمایۂ ملت کے نگہبان

خانوادۂ نانوتوی کے گوہر شب چراغ خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی شخصیت ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے ایک نعمت بے بہا سے کم نہیں تھی ، وہ خاندانی وراثتوں کے امین ، اور علوم وفنون کے ماہر ، اسرار شریعت کے راز داں ، اور محاسن اسلام کے بے باک ترجمان تھے ، درس و تدریس ، تقریر و خطابت ، اصلاح و تربیت ، دعوت و تبلیغ اور انتظام و انصرام ، نیز ملی قیادت جیسے امور میں عظیم خوبیوں کے حامل تھے ، اللہ تعالی ان کو طویل عمر عطا فرمائی ، اور اچھے کارنامے بھی ان کے ذریعہ وجود میں آئے ، زبان رسالت علی صاحبہ الصلاۃ والسلام نے گواہی دی ہے: (خیر الناس من طال عمره و حسن عمله)۔ (بہترین انسان وہ ہے ، جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں)۔

حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کی وفات کی خبر علم و دعوت کے میدان میں بہت محسوس کی گئی ، وہ ادھر کچھ عرصہ سے بیمار تھے ، لیکن اعذار کے باوجود دینی کاموں میں حصہ لیتے تھے ، پوری زندگی دار العلوم دیوبند کی ترقی میں گذار دی ، وہ اپنے والد گرامی حضرت مولانا قاری محمد طیب کے معاون بھی رہے ، طلباء کی کثرت کے پیش نظر ایک دار العلوم قائم کیا ، اور اس کے دائرہ تعلیم کو وسیع کیا ، دعوتی مقاصد کے پیش نظر کتابیں تصنیف کیں ، میدان خطابت کے شہسوار تو تھے ہی ، ان کی تقریریں بہت توجہ اور اہتمام سے سنی جاتی تھیں ، اسی وجہ سے وہ خطیب الاسلام کے نام سے مشہور ہوئے ، وہ مسلم پرسنل لا کے نائب صدر رہے ، دوسری دینی و ملی جماعتوں کی بھی تائید کرتے تھے ، اللہ تعالی نے ان کو علم دین کی توفیقات

عطا فرمائیں تھیں، انہوں نے پوری زندگی اس کے لئے وقف کردی تھی، عوام وخواص میں وہ یکساں مقبول تھے، ان کی علمی مقبولیت کا اندازہ علمی حلقوں میں ان ایوارڈس سے کیا جاسکتا ہے جو ان کے اعزاز میں دئے گئے، ان میں مصری حکومت کی طرف سے ایک ایوارڈ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ایوارڈ، شاہ ولی اللہ ایوارڈ وغیرہ ہیں ۔

مولانا نے اپنا تعلیمی سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں جاری رکھا، اپنے زمانہ کے مایہ ناز علماء اور مشائخ حدیث سے علم حاصل کیا، جن میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا فخر الحسن، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الأدب مولانا اعزاز علی وغیرہ قابل ذکر ہیں، روحانیت اور سلسلہ باطن حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ سے حاصل کیا، اور اپنے والد گرامی قدر حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی ہمہ وقت نگرانی میں رہ کر باطنی ترقی کی، آپ کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات بڑے قیمتی ہوتے تھے، عام مجالس میں بھی بڑی قیمتی نصیحتیں فرماتے تھے۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

> ’’درحقیقت دعوت وتبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان وتعبیر میں حکمت ومصلحت کی رعایتیں بھی جو حضرات انبیاء نے اختیار فرمائی ہیں اور دعوت الی اللہ کو مقبول ومؤثر اور پائیدار بنانے میں جو طرز عمل اختیار فرمایا درحقیقت وہی دعوت کی روح ہے، درحقیقت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے موجودہ زمانے کے احوال کو دیکھ کر کام شروع کیا، کیونکہ لوگوں کے دلوں سے دعوت کا جذبہ ہی نکل گیا تھا، اور اس بات پر بھی زور دیا کہ کلمہ طیبہ کی حقیقت مسلمانوں کے دلوں میں جماؤ اور توحید کے او پر لاؤ جو اصل بنیاد ہے، دوسرے نماز اور ذکر اللہ پر زور دیا کہ اگر نماز کی پابندی ہوگئی اور ذکر کی شان پیدا ہوگئی تو ہزاروں چیزوں کی اصلاح ہوجائے گی اور دینی جذبہ پیدا ہوجائے گا‘‘۔
>
> (ماہنامہ ندائے دارالعلوم وقف، دیوبند شعبان۔ رمضان ۱۴۳۹)

اس اقتباس سے حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے مزاج ومنہاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ وہ دعوت کی راہ میں کس نظام کو برتنے کے حامی تھے، اور کیا چاہتے تھے، مزید معاصر

دعوتی تحریک دعوت واصلاح کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا تھا اور کس نظر سے وہ اس کو دیکھتے اور اس کی افادیت کو تسلیم کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس کے تعلیمی نظام کی قدر افزائی فرماتے تھے اور وہ اس کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اس لئے اس کے سالانہ جلسوں میں تشریف لاتے تھے، اور اپنی بیش قیمت آراء سے دار العلوم کو فائدہ پہونچاتے تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ان کی بڑی قدر فرماتے تھے، اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم تو ان کے درس کے ساتھی ہیں، اس لئے ان کے درمیان باہمی یگانگت اور محبت کا تعلق باقی رہا، ندوۃ العلماء کے سابق معتمد تعلیم حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ بھی ان کے علمی مرتبہ کے قائل تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا نے امام بخاری کی کتاب الأدب المفرد کا اردو میں ترجمہ کیا تو ان کی نگاہ مقدمہ کے لئے حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ پر پڑی، اور مولانا نے ان سے درخواست کی اور انہوں نے اس کو سعادت سمجھ کر اس خدمت کو انجام دیا، وہ مقدمہ علمیت واستناد کے اعلی درجہ پر ہے، مولانا نے واضح الفاظ میں مترجم کی علمی لیاقت کا اعتراف کیا ہے: وہ لکھتے ہیں:

> ''اس پس منظر میں ترجمہ الأدب المفرد کو بلاخوف تردید وقت کی ایک عظیم علمی، دینی اور حدیثی ضرورت کی تکمیل کہا جاسکتا ہے، اسی کے ساتھ مترجم محترم حضرت مولانا عبداللہ عباس صاحب زید مجدہ کہ جن کی وسعت نظر، حسن تعبیر اور حسن فکر کو دیکھتے ہوئے صحت وافادیت کی ضمانت کہنے میں قلم کسی تردد سے دوچار نہیں ہوتے، یقین ہے کہ قارئین محترم اس کتاب سے استفادہ کے بعد ان کلمات کی توثیق ضرور فرمائیں گے، حق تعالی حضرت مصنف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے کمال واخلاص کی بدولت مترجم محترم کی اس ناقابل فراموش خدمت کو شرف قبولیت عامہ اور عزت مقبولیت تامہ سے نواز کر ان کے حق میں اسے زاد آخرت فرمائے: ایں دعاء از من واز جملہ جہاں آمین آباد''۔
>
> (ارشادات نبویہ کی روشنی میں نظام معاشرت: ۱۷۔۱۸)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی شخصیت باوقار اور مستند تصور کی جاتی تھی، وہ اس کے پہلے صدر کے فرزند ارجمند تھے، اولین وقت سے اس کے اجلاس میں شریک رہے، اور اس کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز رہے، انہوں نے اس پوری مدت میں بورڈ کو انتشار وافتراق اور غیروں کے آلہ کار بننے سے بچایا، اور یہی ان کی صلاح وصلاحیت کی دلیل ہے۔

بلاشبہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی سرمایہ ملت کے نگہبان تھے، ان کا وجود امت کے لئے باعث رحمت تھا، انھوں نے پوری زندگی اسی فکر کی نشر واشاعت میں صرف کی، اور ملت کے مفاد کو عزیز رکھا، اختلافات کے زمانہ میں بھی اپنے کو پوری طرح محفوظ رکھا، تبصرہ تو درکنار، حرف شکایت بھی زبان پر لانا گوارہ نہیں کیا اور ایک مصلح اور داعی کی حیثیت سے قابل رشک زندگی گذاری۔ رحمه الله رحمة واسعة وكثر أمثاله فينا.

راقم سطور کا شروع ہی حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ سے نیازمندانہ تعلق رہا، والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ (سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل) تو ان کے رفیق درس تھے، اور برادر گرامی قدر حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی بھی دیوبند میں تدریسی مشغولیت کی وجہ سے بھی حضرت قاری صاحب سے مربوط رہے، اس نسبت سے حضرت قاری صاحبؒ ہمارے ساتھ بہت شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی سے اسی جذبہ اخلاص سے بحمد اللہ تعلق باقی رہا، ملاقاتوں میں اس کا تذکرہ بھی ہوتا تھا، ابھی چند سال قبل دارالعلوم دیوبند وقف میں مجلس مشاورت قائم ہوئی تو راقم کا نام بطور رکن مجلس کے منتخب کیا گیا، اس میں حضرت مولانا سالم قاسمی کی محبت کو دخل ہے، ان کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی (مہتمم دارالعلوم دیوبند وقف) بھی بہت احترام ومحبت کا معاملہ فرماتے ہیں، اللہ تعالی ہمارے عیوب کی ستاری فرمائیں اور اہل تعلق کو شایان شان بدلہ عطا فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں اور پسماندگاں کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور ان کے مشن کو لے کر آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

مولانا محب اللہ لاری ندوی
ایک مخلص اور باعزم شخصیت

دارالعلوم ندوۃ العلماء ایک تعلیمی ادارہ ہے، اس کے قیام کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس درمیان اس کے فضلاء اور فارغین کی تعداد خاصی ہے، وہ عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ قدیم و جدید کے جامع اور زمانہ شناس ہوتے ہیں علوم اسلامیہ میں مہارت کے ساتھ جدید علوم سے بقدر ضرورت واقف ہوتے ہیں تاکہ اشاعت اسلام میں آسانی ہو اور اسلام کی دعوت دور دور تک پہنچے، بحمداللہ اس کے اثرات مثبت انداز میں مرتب ہوئے ہیں اور اب بھی سلسلہ جاری ہے۔

اسی جامعیت کی حامل شخصیات میں مولانا محبت اللہ لاری ندویؒ ہیں۔ انھوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی، اس طرح وہ دونوں ثقافتوں کے حامل رہے۔ فراغت کے بعد وہ دینی اور دعوتی سرگرمیوں میں مشغول رہے اگرچہ کانپور میں ان کا تجارتی سلسلہ تھا جس کو وہ امانت وصداقت کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔

اسی درمیان جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی تجویز پر لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالہ ''ندائے ملت'' کے کاموں کو دیکھنے کے لیے انھیں بلایا گیا، مولانا تشریف لائے لیکن ان کا قیام ندوہ ہی میں رہا اور وہ ''ندائے ملت'' کے دفتر میں مفوضہ کام انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم میں حضرت مولانا محمد عمران خاں ندوی کی ایک مدت تک اہتمام کا منصب سنبھالنے کے بعد بھوپال میں تاج المساجد کی سرگرمیوں کو براہِ راست دیکھنے اور

نگرانی کرنے کے لیے مولانا بھوپال چلے گئے، اس درمیان اہتمام کی ذمہ داری مولانا ابوالعرفان خاں ندوی، قائم مقام مہتمم کی حیثیت سے انجام دے رہے تھے۔ضرورت تھی کہ اس عہدہ کے لیے مستقل کسی ایسے فرد کا انتخاب کیا جائے جو دینی اور عصری ثقافتوں کا حامل ہو۔ ۱۹۶۹ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ کی نگاہ انتخاب مولانا محبّ اللہ لاری پر پڑی۔ حضرت مولانا ان سے واقف بھی تھے کیونکہ وہ ان کے رفقائے درس میں تھے، چنانچہ منصب اہتمام لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ مولانا محبّ اللہ لاری اپنی دور بینی اور نظم کے ذریعہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے اور اس کو تقویت پہنچانے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اسی زمانہ میں مولانا سید عبدالغفار ندوی اور حکیم ضیاء الدین ندوی (یہ دونوں حضرات زمانۂ تعلیم میں مولانا لاری صاحب کے ندوہ کے ساتھیوں میں تھے) بھی مولانا کی اس مہم میں مدد کرنے کے لیے دارالعلوم سے منسلک ہو گئے۔ طلباء کی تعلیمی ترقی اور ان کے اندر مقصدیت کی روح پیدا کرنے کے لیے ان تینوں حضرات نے مل کر کوشش کی لیکن طلباء کی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جو نہ پیش آتا تو بہتر تھا۔ خیر حالات موافق ہوئے اور تعلیمی سرگرمی شروع ہوئی اور مولانا ۲۴؍سال تک دارالعلوم کے منصب اہتمام پر فائز رہے۔ اس درمیان انھوں نے اپنے حسن اخلاق سے اساتذہ اور ملازمین کے دلوں کو جیتا۔ وہ خیر خواہی اور حسن انتظام کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے تھے۔

ان کے زمانہ اہتمام میں کئی اہم کام انجام پائے، ان میں دارالعلوم کا ۸۵؍سالہ جشن تعلیمی ہے جو ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا، اس میں عالم اسلام کے مشاہیر علماء شریک ہوئے، وہ جشن اپنے معیار اور اثرات کے لحاظ سے آج بھی ندوۃ العلماء کا غیر معمولی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ادب اسلامی سمینار منعقد ہوا۔ اس کا انعقاد ۱۹۸۱ء میں ہوا تھا اور وہی رابطہ ادب اسلامی کے قیام کا ذریعہ بنا۔

مولانا محبّ اللہ لاری ندوی اپنی ذمہ داریوں کو اخلاص سے انجام دیتے رہے کہ اسی درمیان ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا۔ ان کی وفات بروز پیر ۱۵/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۴ھ بمطابق ۲۹/نومبر ۱۹۹۳ء میں ہوئی تھی، انھوں ۸۸/سال عمر پائی۔ اپنے پیچھے تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی چھوڑی ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا اشتیاق احمد لاری ندوی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

(مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے انتقال پر چند تأثرات)

بڑے افسوس کے ساتھ یہ خبر اندوہ گیں سنی گئی کہ مشہور عالم دین، عربی زبان کے بے مثال ادیب، ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم، پندرہ روزہ عربی رسالہ کے چیف ایڈیٹر، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری، میرے مخلص اور وفا شعار رفیق جناب مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی ۹/۶/۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶/فروری ۲۰۱۹ء کو طلوع صبح صادق کے آخری لمحات میں دار آخرت کی طرف روانہ ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا واضح رشید حسنی ندوی خانوادۂ علم اللہی کے اہم فرد تھے، میرے مرشد ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے حقیقی بھانجہ اور استاذ گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے چھوٹے بھائی تھے، ان کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں ہوئی، وہ مجھ سے درجہ میں دو سال آگے تھے، فراغت کے بعد وہ آل انڈیا دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو گئے، اور ۱۹۷۳ء تک وہاں رہے، اس درمیان بھی ان کی ندوہ آمد و رفت رہتی، میرے دوست اور مخلص رفیق مولانا محمد الحسنی ان کے برادر نسبتی تھے، اس لئے دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی، وہ ہم دونوں کی مجلس میں شریک ہوتے، اور علمی اور ادبی موضوعات پر اچھی گفتگو ہوتی تھی، ۱۹۷۳ء میں وہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے لئے آئے اور اسی وقت سے اخیر تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، پھر علمی اور ادبی مجالس کا لطف دوبالا ہو گیا، وہ پندرہ روزہ الرائد کے ایڈیٹر بنائے گئے، اور اور البعث میں بھی شریک ادارت رہے، اور حالات حاضرہ پر ان کے مضامین بڑے تجزیاتی اور مدلل ہوتے تھے، وہ

اردو ، انگریزی اور عربی کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے ، اس لئے تینوں زبانوں کی صحافت پر گہری نظر تھی ، عالمی حالات پر ان کا مطالعہ بڑا گہرا تھا، وہ درجنوں کتابوں کے مصنف تھے،فکری موضوعات پر ان کی کئی کتابیں ہیں، یورپ کے تعلیمی نظریات سے واقف تھے اوراس کے عروج وزوال کی تاریخ کا انہوں نے خوب مطالعہ کیا تھا،جس کی جھلک ان کی گفتگو میں نمایاں تھی۔وہ کسی مسئلہ پر بحث کرتے تو اس کے مالہ وما علیہ کو پیش نظر رکھتے۔ عام طور پر وہ تقریر نہیں کرتے تھے،لیکن جب بھی تقریر کی مواد سے بھر پور تقریر کی۔وہ اعلیٰ علمی ذوق کے حامل، یکسوئی کے عادی، انفرادیت پسند اور گوشہ گیر اور بے لوث تھے۔

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندویؒ قلم کے مجاہد تھے، انہوں نے ایک طویل زمانہ تک قلم سے جہاد کیا ، اور ایوان باطل کو للکارا ، مداہنت اور دوہری پالیسی کے قائل نہیں تھے ، بہت صاف دل اور اعلی دماغ کے مالک تھے، عہدہ ومنصب سے دور رہتے تھے، مال ومنال کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی ، ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کا عہدہ جب سنبھالا تو اپنی تنخواہ سے بھی دستبردار ہوگئے ، اور رضائے الٰہی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو مستحکم بنانے میں ان کے مشورہ بڑے قیمتی اور مفید ہوتے ، اساتذہ کو بھی انفرادی ملاقاتوں میں مقصدیت کے ساتھ تدریسی فریضہ انجام دینے تاکید کی، ان پر افراد سازی کی فکر غالب تھی ، انہوں نے کئی نسلوں کی تربیت کی ، اور ان کو عربی کا اچھا انشاء پرداز بنایا، اللہ تعالی نے ان کو اس فن میں کمال عطا فرمایا تھا، عربی زبان وادب کی تدریس ان کا شروع ہی سے موضوع تھا، وہ زبان کے رموز سے آشنا تھے، اور اسی کے مطابق تربیت کر تے تھے، وہ کم گو تھے، لیکن ان کی گفتگو میں بڑی معنویت ہوتی تھی۔

ان کی وفات سے ندوۃ العلماء میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے، ندوہ اپنے ایک علمی اور تعلیمی محسن سے محروم ہوگیا، وہ دنیا سے تو چلے گئے لیکن جریدۂ عالم پر اپنے نقوش ثبت کر گئے ، جس پر ان کی تصنیفات گواہ ہیں۔انہوں نے اپنے پیچھے علمی ودینی صلاحیتوں سے

بھر پور ایک کنبہ چھوڑا، ان کے صاحبزادے مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ہیں، ان کی کئی اولادیں ہیں، جو ماشاءاللہ بہت ذی استعداد اور باصلاحیت ہیں۔ ان کے علاوہ شاگردوں کی بڑی تعداد ان کے وفات پر گریہ کناں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں، اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں۔

پریس نوٹ :

عالم سلام ایک بے باک صحافی اور ماہر تعلیم سے محروم

آج بروز بدھ ۱۶/ جنوری ۲۰۱۹ء بوقت صبح مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی برادر خورد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا، مولانا ایک بے لوث داعی، خاموش مجاہد، باکمال مصنف، مفکر، عظیم دانشور، ماہر تعلیمات اور قلم کے دھنی تھے، برصغیر ہندوپاک میں عربی زبان وادب اور جدید عربی صحافت کی آبرو تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم وطن رائے بریلی سے حاصل کی، عالیہ درجات کی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آئے، ۱۹۵۱ء میں ندوۃ العلماء کے شعبہ تخصص عربی ادب سے فارغ ہوئے، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم، اے کیا۔

آپ کی عملی زندگی کی ابتداء آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت مترجم و اناؤنسر کے ذریعہ ہوئی، جہاں آپ نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۳ء تک کام کیا، اس دوران آپ نے علوم سیاسیات و سوشیالوجی، انگریزی زبان و ادب، مغربی تمدن و سیاست، اس کے اتار چڑھاؤ اور عام زندگی پر اس کے اثرات کا گہرائی سے مطالعہ کیا، آپ کے متعدد علمی و ادبی مقالات ومضامین، کہانیاں اور تمثیلی ڈرامے دہلی اور دیگر مقامات کے ریڈیو اسٹیشنوں سے عربی زبان میں شائع ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاذ مقرر ہوئے، اور پندرہ روزہ الرائد کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، اور ۲۰۰۰ء میں عربی فیکلٹی کے

صدر شعبہ، المعهد العالی للدعوة والفكر الاسلامی کے ڈائریکٹر، اور ۲۰۰۶ء میں مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی وفات کے بعد ندوہ کے معتمد تعلیم بھی رہے۔ عربی صحافت میں پندرہ روزہ الرائد اور البعث الاسلامی آپ کی قلم ریزیوں کا شاہد عدل ہیں، عربی ماہنامہ البعث الاسلامی میں شریک ادارت رہے اور حالات حاضرہ کا کالم لکھتے تھے، جو بہت مقبول تھا۔

عہدے اور مناصب:

- معتمد تعلیم ندوة العلماء
- جنرل سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی
- جنرل سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام
- رکن ابوالکلام آزاد سوسائٹی لکھنؤ
- ناظم مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر رائے بریلی
- نائب صدر دارعرفات رائے بریلی

اس کے علاوہ آپ ملک وبیرون ملک خاص طور پر قاہرہ، عمان، لاہور، تاشقند، مکہ مکرمہ، آکسفورڈ یونیورسٹی، ریاض، مدینہ منورہ اور استانبول وغیر کے علمی وادبی اور تربیتی سیمیناروں میں شریک رہے۔

ان کی مشہور کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

- تاریخ الأدب العربی (العصر الجاهلی)
- نحو نظام عالمی جدید
- مصادر الأدب العربی
- الإمام أحمد بن عرفان الشهيد أدب أهل القلوب
- المسحة الأدبية من كتابات الشيخ أبی الحسن
- الشيخ أبو الحسن قائدا حكيما

- مختصر الشمائل المحدية
- أعلام الأدب العربی
- الدعوة الاسلامية ومناهجها
- من صناعة الموت الی صناعة القرارات
- حركة التعليم الدينی و تطور المنهج ۔
- حركة رسالة الانسانية

عربی ترجمے:

- فضائل القرآن
- فضائل الصلاة علی النبی
- الدين والعلوم العقلية

اردو کتابیں:

- محسن انسانیت سلطان ٹیپوشہید ایک تاریخ ساز قائدو شخصیت
- مسئلہ فلسطین ندوۃ العلماء ایک رہنما تعلیمی مرکز اور تحریک اصلاح ودعوت
- نظام تعلیم وتربیت: اندیشے، تقاضے اور حل
- اسلام مکمل نظام زندگی (حدیث نبوی کی روشنی میں)

انتقال کی خبر سنتے ہی متعلقین کی ندوہ آمد شروع ہوگئی، تعزیت پیش کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا، دار العلوم کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے ان کے انتقال کو ایک بڑا خسارہ قرار دیا، تعزیت پیش کرنے والوں میں مولانا خالد رشید فرنگی محلی، ریتا بہوگنا جوشی اور سیاسی اور غیر سیاسی حضرات نے اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کیا، بیرون ہند سے خاص طور سے امام کعبہ شیخ خالد بن علی غامدی اور سعودی ایمبیسی کے دینی مشیر احمد رومی نے تعزیت پیش کی۔

صالح اور تعمیری فکر کے علمبردار

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

مجھے وہ لمحہ، وہ ساعت اور وہ گھڑی اچھی طرح یاد ہے جس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات سے پورے عالم اسلام پر حزن والم کے بادل چھائے ہوئے تھے، اس سنسنی خیز خبر کو سننے کو بعد ایسا لگ رہا تھا کہ گویا دلوں کی دھڑکن رک گئی ہے، زبانیں گنگ ہوگئیں ہیں، اور قلم کی سیاہی خشک پڑ گئی، رفتار زمانہ بھی گویا رک کر ماتم کررہی تھی، اس واقعہ سے تقریباً ۲۱ رسال پہلے میرے رفیق محترم مولانا سید محمد الحسنیؒ کی وفات کا سانحہ پیش آیا، اس وقت عاجز کے قلم سے یہ جملے نکلے تھے کہ:

> ’’یقیناً مولانا محمد الحسنیؒ کی رحلت کا سانحہ ایسا دردانگیز ہے کہ مارے غم کے سینہ پھٹا جارہا ہے، زبان گنگ ہو رہی ہیں، ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں، جن سے ہمارے درد والم کا اظہار ہوسکے، زمانہ اور زمانہ کی ہر چیز حسب حال اپنے اپنے رفتار سے چل رہی تھی، ہمیں احساس بھی نہیں تھا کہ مولانا ہمارے درمیان سے اچانک اس طرح رخصت ہوجائیں گے، اور ہمیں حیران وششدر چھوڑ جائیں گے، لیکن اللہ کا فیصلہ کو کون ٹال سکتا ہے (و كان أمر الله قدرا مقدورا)‘‘۔

مولانا محمد الحسنیؒ عام نوجوانوں کی طرح نہیں تھے، بلکہ اپنی فکر سلیم سے دوسروں پر فوقیت رکھتے تھے، چنانچہ وہ ابتداء ہی سے مستقبل بعید کو فراست کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ان چیزوں کے بارے میں سوچتے جہاں تک عام نوجوانوں کی رسائی بھی نہیں ہوتی، خاص

طور سے عالم اسلام کے احوال وکوائف کا جائزہ لیتے تھے،فکر اسلامی اور عالمی مسائل پر ان کی نظر گہری تھی، یہاں کہ بڑے بڑے دانشوروں اور مفکرین وداعیان اسلام اور ماہرین کی طرح اپنی رائے بھی پیش کرتے تھے، مجھے ان کے اندر وہ ساری خوبیاں نظر آئیں، جن کا میں آرزومند تھا، اور جن کے لئے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے مقیم تھا، چنانچہ میں نے اس نوجوان کی ہم نشینی اختیار کرلی کہ ان کے ذریعہ بلندی کے اس مقام پہونچا جاسکتا ہے، وہ فکر اسلامی کے اس درجہ پر پہونچ گئے جہاں ماہرین فن نہیں پہونچتے ہیں، چہ جائیکہ اٹھارہ سال کا ایک نوخیز نوجوان۔ان کی فکری بلندی کی ایک مثال پیش خدمت ہے:

''اس کرۂ ارض پر ایک ایسا گروہ ہے جو''واقعیت (حقیقت پسندانہ فلسفہ) کو پسند کرتا ہے، اور اس کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے، لیکن وہ حقیقت پسندی کے اظہار سے اس قدر دور بھاگتا ہے جس طرح کہ شتر مرغ، جو خطرات کے وقت ریت میں سر ڈال کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے، تو یہاں تجدد پسندوں یا صحیح الفاظ میں مغربیت پسند لوگوں کا گروہ ہے، جس میں سائنسدانوں، تاریخ وثقافت کے ماہرین، فنکار ادباء، اور آرٹسٹ وغیرہ شامل ہیں، جو واقعیت کو دلیل بنا کر ہر طرح کے لہو ولعب، فضول وبیکار، غیر معقول، اور زندگی کے ہر رنگ وپھول، درندگی وبہیمیت، غرض ہر چھوٹی بڑی چیز سے اپنا جی بہلاتے ہیں''۔

اور اب ایک تیسرا دردناک واقعہ پیش آیا، جس سے ہمیں نہایت ہی رنج وغم ہوا، ہمارے صدیق مکرم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بروز بدھ ۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶/جنوری ۲۰۱۹ء اس دارفانی سے رخصت ہوگئے: (یأیتها النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربك راضية مرضية ، فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی)

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کا تعلق ان لوگوں سے نہیں تھا، جن کی شہرت و پہچان صرف ان کے بڑے بڑے کارناموں اور بے نظیر خدمات سے ہوتی ہے، بلکہ وہ تو ہر طرح کی شہرت ونا موری سے دور، لوگوں کی طرف سے نوازے گئے بے جا القاب سے الگ رہتے تھے، ایک متواضع، قناعت پسند، مخلص داعی، ماہر عالم دین اور ادیب دوراں کی طرح گمنامی کے ساتھ کام کرتے رہے، ۱۹۵۲ء میں جب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تخصص فی الادب العربی میں تھا، اسی وقت سے مولانا سے میرا تعلق اور ربط رہا، ۱۹۷۳ء میں جب دارالعلوم میں مولانا ادب عربی کے استاد کی حیثیت سے تشریف لائے تو مجھے تاریخ ادب عربی اور صحافت کے میدان میں ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اس دوران انہوں نے ''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' جیسے عظیم رسالوں میں عالمی مسائل اور موقع پرست سیاست (جن سے طاقتور ممالک اور عالمی اقوام غلط فائدہ اٹھاتی ہے) پر قیمتی مضامین لکھے، چنانچہ انہوں نے اپنی مؤثر اور طاقتور تحریر اور سیال قلم کے ذریعہ موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالات سے واقفیت کی بناء پر استعماریت کے زیر نگیں ہونے والی پلاننگ کو طشت از بام کیا، اور دین سے سیاست کو الگ کرنے یا دوسری تعبیر میں مشرق و مغرب کے درمیان تفریق پیدا کرنے اور یورپ کا اپنے آپ کو پس ماندہ مشرق کا رہنما اور آئیڈیل قرار دینے کی پوری حکمت عملی کو واضح کیا، اور تیسری دنیا سے متعلق اس کے مجرمانہ منصوبوں کا پردہ فاش کر دیا۔

مولانا اس نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس ایک مکمل صدی کا وقفہ مغرب کا مشرق سے اتصال کا وقفہ تھا، اسی میں مغربی دانشوران، مفکرین اور سیاست دانوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے، اور ان کی علمی وفکری وراثت کو سمجھنے اور ان کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا، یہ وقفہ ان تمام شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے کافی تھا جو بیسویں صدی کے آغاز میں مستشرقین اور مسیحیت کے ان علمبرداروں

(جنہوں نے استعماریت کے مفاد میں تاریخ کے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا) کے ذریعہ پھیلائی گئی تھی، لیکن عالم اسلام پر گہری نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ مغرب مسلسل اپنے اُسی دائرۂ فکر میں محدود رہا، جو انہیں صلیبی میسیحیت کے علمبردار، اور اسلام دشمن مستشرقین سے ملا تھا، اور معاصر قلم کار بھی بعینہ اسی نہج پر چلتے رہے، اور یہ اس فکر کا نتیجہ ہے جو مغرب نے مشرق پر اپنے تسلط کے دوران پیدا کی تھی، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ مشرق پر ان کا تسلط اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ وہ ان پر فکری حملہ نہ کریں، تاکہ نسل نو کا اپنے روشن وتابناک ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے، وہ اپنی قومی اور دینی واخلاقی خصوصیات سے الگ ہو جائیں اور اپنی عظمت رفتہ کی بحالی کا خواب بھی نہ دیکھ سکیں، اور ان کی طبیعت مغرب سے ہم آہنگ ہو جائے"۔

اسی کے ساتھ مولانا کو ہمیشہ یہ غم کھائے جاتا تھا کہ مسلمان اسلامی تعلیمات کی مکمل نمائندگی کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ ہر گروہ اور ہر جماعت ایک متحدہ مقصد پر توجہ دئے بغیر مخصوص نظریات کے ساتھ محدود ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے دعوت اسلامی کو نقصان ہو اہے، اور امت میں تفریق پیدا ہوگئی ہے، یہاں تک کہ جس اعتدال اور ہم آہنگی کی اسلام دعوت دیتا ہے، اس کی اہمیت بھی کم ہوگئی ہے، اور لوگوں کی نگاہ میں دعوت کی حیثیت بالکل ختم ہوگئی، یہی نہیں بلکہ جو لوگ اس کام کو انجام دیتے ہیں ان کے بارے میں بھی لوگوں کا گمان برا ہو گیا ہے، ایک موقعہ انہوں نے اپنے درد کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"آج مسلمانوں کا المیہ یہ نہیں کہ ان میں اسلامی زندگی کی جھلک نظر نہیں آرہی ہے، بلکہ المیہ یہ ہے کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں ان اسلامی تعلیمات کی نمائندگی تو کی جارہی ہے، لیکن اتحاد سے خالی ہے، چنانچہ ہمارے درمیان خالص عقیدۂ توحید کے داعی موجود ہیں، اخلاق وعبادات پر پوری توجہ دی جارہی ہے، پورے زور وشور کے ساتھ اسلام کی دعوت کا

کام ہورہا ہے، اسلام کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے، غرض اسلام کے ہر جزء کو شعبۂ حیات میں نافذ کردیا گیا ہے، لیکن یہ تمام تر کوششیں منتشر ہیں، ایک گروہ جو ایک مخصوص عمل میں لگا ہوا ہے، وہ دوسرے عمل پر توجہ دینے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا، بسا اوقات ایک فریق کسی ایک مخصوص عمل میں مشغول ہوتا ہے، تو اس کا انہماک اس حدتک بڑھ جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے شعبہ سے واقفیت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، لہذا جب اس نے تعلیم کو اپنا مشغلۂ حیات بنالیا تو کسی علاقہ میں پھیلنے والے ارتداد سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے، اور اگر وہ دعوت کے کام میں مشغول ہیں تو مسلمانوں میں جہالت اور گمراہی کے پھیلنے پر انہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا ہے، اور جب وہ لوگوں کی خدمت، اوران کی اقتصادی ومعاشی مسئلہ کو حل کرنے میں لگا ہے تو اللہ سے مضبوط ربط بنانے، اسلامی شعائر کو اپنانے اور لوگوں کی اصلاح کی طرف ان کی توجہ نہیں جاتی ہے، لہذا ان تمام بے ترتیبی اور غیر منظّم نظام کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں بہت سے اجتماعی اور اور انفرادی بیماریاں پیدا ہوتی جارہی ہیں، خلاصہ کلام یہ کہ موجودہ دور میں اصلاحی کوششوں اور اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ان کی عدم ہم آہنگی اور displain شکنی ہے''۔

یہ مولانا کی فکری اور علمی کاوشوں کی ایک جھلک تھی جو مولانا زندگی بھر انجام دیتے رہے، واقعی آپ کی شخصیت معتدل امت کی ایک انوکھی مثال تھی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت مولانا عبداللہ کاپودرویؒ:

ایک قابل فخر شخصیت

صوبۂ گجرات شروع ہی سے علم وعمل کا مخزن رہا ہے، پہلی صدی ہجری ہی میں یہاں عرب مسلمانوں کی آمد ہوئی، جس سے یہاں علم وعمل کی کہکشاں سجی، اوراس کا سلسلہ دراز ہوا، اور شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے تو اس سلسلہ کو سلسلۃ الذہب بنا دیا، ان کی تصنیفات اور کاوشوں کا شہرہ برصغیر کے حدود کو پار کرتے ہوئے اقصائے عالم میں پہونچا، آج بھی علم ودانش کے مراکز ان کی تحقیقات کے خوشہ چیں ہیں، علم وادب کی دنیا میں علامہ عبدالعزیز میمنی کی شخصیت کا معاصر علماء میں کوئی ثانی نہیں نظر آتا، ان کی علمی عبقریت کا زمانہ شاہد ہے، اور صرف ان کا تذکرہ ہی علمی استناد کے لئے کافی ہے، بلاشبہ فخر گجرات حضرت مولانا عبداللہ اسماعیل کاپوردوی کی شخصیت میں ان اسلاف کا عکس پوری طرح نمایاں ہے،اور وہ ان کے صحیح معنوں میں جانشیں قرار دئے جاسکتے ہیں۔

نسلوں کے مربی اور عظیم مصلح:

مولانا عبداللہ کاپودروی گجرات کے کبار علماء میں تھے، وہ کئی نسلوں کے مربی، عظیم مصلح اور جید عالم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو شروع ہی سے اس راہ کے لئے منتخب کرلیا، چنانچہ اسی نہج پر ان کی پرورش ہوئی، انہوں نے ابتدائی تعلیم صوبہ گجرات ہی میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لئے بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں دارالعلوم دیوبند آئے اور وہاں کے علماء اور مشائخ سے علم حاصل کیا، اور علوم اسلامیہ میں کمال پیدا کیا، علوم اسلامیہ کی تحصیل

کے بعد وہ ان کی تبلیغ واشاعت اور نئی نسل کی تربیت میں مشغول ہوگئے، اور ایمان وتقوی کی بنیاد پر ایسی تربیت کی کہ وہ نسل دعوتی ذمہ داریوں کے اٹھانے کے لائق ہوگئی، اللہ تعالی نے ان کو اس میدان میں بھی کمال عطا فرمایا تھا، یہی وجہ ہے کہ گجرات کے علماء کی بڑی تعداد ان کے تلامذہ میں شمار کی جاتی ہے۔

فراغت کے بعد جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اس دوران افادۂ عام کے ذریعہ مرجع خلائق بنے رہے، ہر صلاحیت کے طلباء کا ان کے پاس ہجوم ہوتا، اور وہ صحیح اسلامی بنیادوں پر ان کی تربیت کرتے تھے، اس کے بعد انہوں نے دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر کی انتظامی ذمہ داری سنبھالی، تو ان کو مزید اس میدان میں وسعت کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، وہ ایسے فضلاء اور فارغین تیار کرنے کے خواہشمند تھے، جو علم وعمل کے جامع ہوں، وہ ہدایت کا چراغ ہوں، ان کے ذریعہ بندگان خدا کو رہنمائی ملتی ہو، وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے اصول کو پوری طرح سمجھے ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان اصول سے بھی انہوں نے کبھی چشم پوشی نہیں کی، اور برابر ان کو توجہ اس پر رہی، دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر میں وہ یہ ذمہ داری ۲۷/سال تک نبھاتے رہے، اور سالکین راہ وفا تیار کرتے رہے۔

داعیانہ مزاج کی حامل شخصیت:

مولانا عبد اللہ کاپودرویؒ کی شخصیت میں ایک مخلص داعی اور کامیاب مصلح کی صلاحیتیں شروع ہی سے پوشیدہ تھیں، وہ زمانہ طالب علمی ہی سے اصلاح ودعوت کا مزاج رکھتے تھے، اور ظاہر ہے کہ تعلیم کا مقصد اساسی دعوت ہے، تعلیم ایک وسیلہ ہے، جس سے دعوت کے مقاصد کو بروئے کار لایا جاتا ہے، انبیاء کرام کے طریقہ دعوت کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، اس لئے وہ کسی آن اور کسی لمحہ اس پہلو سے چشم پوشی کرنا گناہ تصور

کرتے تھے، ملک میں رہتے ہوئے اس کی طرف توجہ کی، اور ملک سے باہر افریقہ، یورپ، امریکہ اور کینیڈا، عراق، مصر، سعودیہ وغیرہ ممالک کے اسفار کئے اور وہاں حسب مقدرت دعوتی مشن کو آگے بڑھایا، اس طرح انہوں نے (اللھم ھل بلغت) کی سنت بھی ادا کی، بے شمار کانفرنسوں، جلسوں، اجتماعات، مذکراہ علمی میں شرکت کی، ہر جگہ یہی عنصر کارفرما رہا کہ امت کے افراد کی اصلاح کیسے ہو، اور وہ صحیح راستے پر کیسے آئیں، جہاں ضرورت تھی حکمت کے ساتھ دعوت دینے کی، وہاں قرآنی حکمت کو استعمال کیا، اور جہاں موعظہ حسنہ اور مجادلة بالتي هي أحسن کو ضروری سمجھا وہاں ان کو استعمال کیا، اس طرح قرآنی اصول دعوت کو پوری زندگی برتا، اور اس سے کسی پہلو انحراف نہیں کیا، وہ اچھے واعظ اور خطیب تھے، اور اچھے قلمکار بھی، گویا زبان اور قلم کی دونوں طاقتیں فیاض ازل نے ان کو عطا فرمائیں تھیں، اور وہ ان دونوں صلاحیتوں کو اس کار دعوت کے لئے حسن وخوبی کے ساتھ استعمال کرتے تھے، ان کے بے شمار مقالات اور کتابیں ہیں، اور ان کے مواعظ کا بھی مجموعہ ہے، ان تمام سے یہی روح جھلکتی اور نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی تحریری کاوشوں میں اس وقت میرے سامنے ان کے کئی مجموعے ہیں، جن میں سے دو کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے:

(ا) افکار پریشاں (دو جلدیں)

یہ ان کے بکھرے ہوئے مقالات کا مجموعہ ہے، دو جلدوں میں ہے، پہلی جلد میں تقریباً ۲۴/ مقالات ہیں، جو متنوع مواد کے حامل ہیں، ان میں علم بھی ہے، اور ادب بھی، تاریخ بھی ہے اور سیرت بھی، فقہ بھی اور بصیرت بھی، اور دوسری جلد چار ابواب پر مشتمل ہے، جن میں پہلے باب میں علامہ قطب الدین نہروالی، اور علامہ محمد یوسف بنوری پر مقالات ہیں، دوسرے باب میں معاصر شخصیات میں مفتی عبدالرحیم لاجپوری، حضرت مولانا شاہ ابرارالحق وغیرہ پر مضامین ہیں، تیسرا باب سفرنامہ سے متعلق ہے، یہ سفرنامہ دبئی اور امریکہ سے متعلق

ہے، یہ سوصفحات پر مشتمل ہے، اور چوتھا باب عربی نگارشات سے متعلق ہے، اس کا مرکزی عنوان ہے: نبضات القلب الواعی ۔اس میں پانچ مضامین ہیں:

هكذا ينهار الباطل

ثورة الخميني ۔ (الفتنة الكبرى للأمة الاسلامية)

أهمية التعليم فى الإسلام

الدعاء سلاح المؤمن ۔ ما هو واجبنا اليوم ؟ وغیرہ

(۲) رشد و ہدایت کے مینار، جن سے میں نے کسب فیض کیا

یہ کتاب شخصیات کی سوانح عمری سے متعلق ہے، اس میں ۵۵/شخصیات کا تذکرہ ہے، خاص طور سے ان شخصیات کا، جن سے صاحب تذکرہ نے استفادہ کیا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے اس کتاب کو اپنے مقدمہ میں ''ایک فیض رساں کتاب'' قرار دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب محسنین کے تذکرہ پر کوئی کتاب ہو تو اس کا فیض دور دور تک پہونچتا ہے، مولانا نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے تذکرہ میں اپنے ندوہ آنے اور ان سے ملاقات کا تذکرہ اچھے انداز میں کیا ہے:

> ''غالباً ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم افریقی طلباء نے گرمی کی تعطیلات میں افریقی طلباء کا جلسہ کیا، دیوبند اور دیگر مدارس میں پڑھنے والے افریقی طلباء کو بھی اس میں شرکت کی دعوت ملی، چنانچہ دارالعلوم دیوبند سے بھی افریقی طلباء لکھنؤ پہونچے، ہم نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر ندوۃ العلماء کے کئی اساتذہ سے ملاقات کی اور ندوہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا، ندوہ میں قیام کے دوران اطلاع ملی کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے وطن دریاباد سے لکھنؤ تشریف لائے ہیں، کچہری روڈ پر صدق جدید کے ناظم مولوی عبدالقوی صاحب کے مکان میں مقیم ہیں''۔
>
> (رشد و ہدایت کے مینار: ۲۱۰)

مولانا کاپودروی نے تصنیفات وتألیفات کے ذریعہ ایک بڑے طبقہ کومتأثر کیا، وہ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے تھے، انہوں نے ان دونوں زبانوں کو دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی ہی میں سیکھ لیا تھا، اور اس صلاحیت کو جلا دیتے رہے، اور دعوت کے لئے استعمال کرتے رہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ندوۃ العلماء سے تعلق

یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جب البعث الاسلامی نکلا، تو اس کی توسیع اشاعت کے لئے ہم نے ایک سفر کیا، وہ سفر کانپور، آگرہ، دہلی، دیوبند اور علی گڑھ کا تھا، اس سفر میں صرف میں اور میرے مخلص دوست مولانا محمد الحسنیؒ تھے، بحمد اللہ یہ سفر بڑا مفید، کارآمد اور نتیجہ خیز ثابت ہوا، ہم لوگ جب دیوبند پہونچے تو وہاں جن طلباء سے ملاقات ہوئی، ان میں مولانا عبداللہ کاپودروی بھی تھے، وہ ماشاء اللہ بڑے نشیط، فعال اور محنتی تھے۔ اور طلباء کے جداری پرچہ کے ذمہ دار بھی تھے، وہ بڑی محبت سے ملے، اور انہوں نے البعث الاسلامی کا استقبال کیا، اور اس کو اپنے جذبات اور مزاج سے قریب پایا، اور ہم لوگوں کی قدر کی، اس کے بعد سے وہ برابر البعث کے قاری رہے، اور اپنی رائے اور مفید باتوں سے نوازتے رہتے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کا والہانہ تعلق تھا، ان کی کتابوں کے عاشق اور دلدادہ تھے، انہوں نے ایک مضمون قصص النبیین پر بھی لکھا ہے جو ان کے مجموعہ مقالات ’’افکار پریشاں جلد اول‘‘ میں موجود ہے، اس طرح فکری طور پر بھی ندوۃ العلماء کے شعار ودعوت سے مطمئن ہی نہیں تھے، بلکہ اس کے داعی تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کئی بار آئے، اور رابطہ ادب اسلامی کے پروگراموں میں شرکت کی، حضرت مولاناؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے بھی ان کا تعلق رہا، اور ان سے بھی اسی عقیدت واحترام کے ساتھ ملتے رہے، جس طرح

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے تھے، گجرات کے سفر میں حضرت مولانا مدظلہ العالی کے لئے زیادہ سے زیادہ افادہ کے راستے ہموار کرتے۔

میں ان کو ۱۹۵۵ء سے جانتا ہوں، اسی وقت سے جب البعث الاسلامی کا پہلا شمارہ لے کر ہم دارالعلوم دیوبند حاضر ہوئے تھے، اور وہاں ان سے ملاقات ہوئی، ان کے ساتھ وہاں عربی کا ایک جداری پرچہ اسماعیل افریقی صاحب نکالتے تھے، اور یہ دونوں حضرات اس کا اہتمام کرتے تھے، ان کے پہلے تعارف سے لے کر وفات تک کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا، ابھی چند سال قبل ندوۃ العلماء تشریف لائے تو دارالعلوم میں شعبہ حفظ کا جلسہ میری صدارت میں تھا، میں نے ان کو اپنے ساتھ لیا، وہ جلسہ میں تشریف لے گئے اور طلباء کو خطاب کیا، خطاب کیا تھا، بس جذبات وعقیدت کا ایک سمندر تھا، جو ندوۃ العلماء سے ہو کر گذر رہا تھا۔ اس خطاب سے طلباء مستفید ہوئے، دارالعلوم دیوبند وقف میں چند سال قبل مجلس مشاورت قائم ہوئی تو مجھے بھی اس کا رکن نامزد کیا گیا، مولانا کاپودروی بھی دارالعلوم وقف کے سلسلہ میں بڑے فکر رہے، بعد میں وہ بھی مجلس مشاورت کے رکن بنے، وہ سالانہ نشستوں میں اور مشوروں میں شریک ہوتے، اور اپنی رائے کا اظہار کرتے، اس موقع پر ملاقات ہوتی، اور تبادلہ خیال کا موقع ملتا۔

بلاشبہ مولانا عبداللہ کاپودروی ایک نمونہ کی شخصیت تھی، انہوں نے ایک قابل رشک زندگی گذاری، وہ بجا طور پر فخر گجرات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی ذات میں بے شمار خوبیاں جمع ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے، اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کے فیوض وافادات کو عام وتام فرمائے۔ وما ذلك على الله بعزيز.

مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ: ایک بلند پایہ شخصیت

مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ جنہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مفتی صاحب کے نام سے جانا جاتا تھا، اب ہمارے درمیان نہیں رہے، آٹھ دہائیوں پر مشتمل ان کی زندگی کا ہر ورق علم و دین کی خدمت سے عبارت ہے، آپ کا وجود ایک ایسا سایہ دار درخت تھا، جس کے نیچے نسلیں پروان چڑھیں، ایسا چشمہ صافی تھا، جس سے تشنگان علم وفقہ سیراب ہوئے، ایسا آفتاب تھا جس سے ایک عالم کا عالم منور ہوا۔

مفتی صاحب نے ۱۹۲۷ء میں اس مادی دنیا میں آنکھیں کھولیں، اس طرح ان کی عمر ۸۹ سال تھی، ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی، ۱۹۴۴ء میں آپ ندوہ میں داخل ہوئے اور اپنی محنت و لگن سے فقہ اسلامی میں مہارت پیدا کی، ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کے استاذ فقہ متعین ہوئے، اس موضوع پر انہوں نے دارالعلوم کے صدر استاذ محترم مولانا مفتی محمد سعید اعظمی ندویؒ سے خوب استفادہ کیا، مفتی صاحب کو ان سے رشتہ قرابت نے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع فراہم کیا، ۱۹۶۰ء میں مفتی سعید صاحبؒ کی وفات کے بعد انتظامیہ کے مشورہ سے آپ شعبہ افتاء کے منصب پر فائز ہوئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کا ذہن، حاضر جوابی، دقیقہ رسی اور فقہ و فتاویٰ پر زبردست مہارت عطا کی تھی، جس کی بدولت وہ طلباء وعوام کا مرکز توجہ اور دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔

آپ کی زندگی تواضع اور بے نفسی سے عبارت تھی، انکسار و بے لوثی آپ کا طرۂ امتیاز تھا، ایک بے مثال فقیہ اور مختلف عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود تواضع کا یہ عالم تھا کہ جس کام پر لگا دیا گیا راضی بہ رضا تیار ہو گئے، ایک شہرۂ آفاق دینی درسگاہ میں مفتیٔ عام کے عہدہ پر فائز ہیں اور تعمیری کام بھی کئے جا رہے ہیں، دارالعلوم کو مالی تعاون کی ضرورت

ہوئی تو اس کے لئے سفر بھی کررہے ہیں، ذمہ داروں نے طے کردیا تو ہاسٹل میں مقیم طلبہ کے مطبخ کا نظم وضبط بھی سنبھال رہے ہیں، اور پھر یونہی نہیں، سارے کام بحسن وخوبی انجام دئے جارہے ہیں، آپ کا وجود باران رحمت کی طرح تھا، ہر ایک کو شامل، یا شعاع آفتاب کی طرح ہر ایک کو محیط ہے۔

آپ کی ان تنظیمی صلاحیتوں اور کام کے سلسلہ میں لگن اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے ندوۃ العلماء میں پہلے نائب مہتمم اور پھر نائب ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے، اور اس پر آپ کی علمی، فقہی اور تحقیقی ذمہ داریاں مستزاد تھیں، آپ ان تمام ذمہ داریوں کو حیات مستعار کی آخری گھڑیوں تک سنبھالتے رہے، جب تک سانس کا جسم وجان سے رشتہ نہیں ٹوٹا، ندوہ سے آپ کا رشتہ نہیں ٹوٹا، یہ ذمہ داریاں آپ نے دم واپسیں کے ساتھ ہی واپس کیں، ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۲۲/ ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۵/ ستمبر ۲۰۱۶ء کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ آپ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا، ستاروں کے بجھتے ہوئے چراغوں سے ابھی دھواں ہی نکل رہا تھا کہ آپ کی شمع حیات بجھ گئی ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

مگر اس آفتاب نے جاتے جاتے علم وفن، فقہ وفتاویٰ، اخلاص واحتساب اور تواضع وانکساری کے افق پر جو گہرے رنگ ڈالے، وہ کیونکر مٹ سکیں گے اور اپنے پیچھے ماہ وانجم کی جو قطاریں چھوڑ گیا وہ ان شاء اللہ اس شبِ تار میں نشانِ منزل ثابت ہوں گے۔

میں بذاتِ خود بیشتر علمی، فقہی اور تنظیمی کاموں میں ان کے ساتھ شریک ہوا، میں نے پایا کہ وہ نہایت مخلص، صائب الرائے، دوربین اور عاقبت اندیش ہیں، ندوۃ العلماء اس کی تاریخ اور یہاں کے اسلاف سے بے انتہا محبت کرنے والے ہیں، اور ان کے

خلاف کوئی بے جا بات سننا گوارا نہیں کرتے۔

مفتی صاحب کلیۃ الشریعہ واُصول الدین کے عمید اور المعہد العالی للقضاء والافتاء کے نگراں رہے، اس کے لئے آپ نے اپنی ساری علمی اور فقہی توانائیاں صرف کردیں، اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، فقہی سوالات کے جوابات جو آپ کے ذریعہ لوگوں کے استفسار اور استفتاءات کے طور پر دئے گئے بڑے معنی خیز اور مختصر و جامع ہوا کرتے تھے، خاص طور پر مسائل حاضرہ، عائلی قانون اور سماجی و ثقافتی استفتاءات کے جوابات قابل آفریں واستفادہ ہیں، ان موضوعات پر آپ کی بڑی گہری نظر تھی، آپ کی فقہی آراء قرآن وسنت، اجماع امت اور قدیم فقہاء کے اجتہادات اور قیاس پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح آپ دار العلوم ندوۃ العلماء میں فقہی موضوعات اور کتب فتاویٰ کا درس بھی دیتے رہے، اور شعبۂ تدریب افتاء میں داخل ہونے والے طلبہ کی مشق وتمرین پر زور دیتے، اور قرآن وسنت کے مطابق فتوے دینے اور مسائل کو حل کرنے میں راہ اعتدال کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے اور اسی کی تربیت کرتے۔ مفتی صاحب کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شفقتیں حاصل رہیں۔

آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک علم وفقہ کے اس بار امانت کو اٹھائے چلتے رہے، تورع وتفقہ اور علم وحلم کی یہ شان آخری دم تک باقی رہی، اخیر عمر میں مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہونے کے باوجود آپ نے انتظامی امور میں کبھی کوتاہی نہیں کی، زندگی کے اخیر زمانہ میں آپ ندوہ کے نائب ناظم متعین ہوئے، اس سے پہلے عرصۂ دراز تک آپ نائب مہتمم کے فرائض انجام دے چکے تھے، پیام اجل قبول کرنے تک آپ نے کبھی ادائے فرض پر تن آسانی کو ترجیح نہیں دی۔

مفتی صاحب کو دار العلوم سے بے پناہ محبت تھی، دار العلوم کی خدمت میں جان ومال کو قربان کیا، اور استقامت کے پیکر رہے، ان کے فتاوی مصادر شریعت کے مطابق اور

زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والے تھے، ادارہ کے سلسلہ میں صائب الرائی تھے، لیکن حسب موقع سخت موقف بھی اختیار کرتے تھے، وفاداری، محنت، علم وتفقہ، اوراحساس ذمہ داری، حلم وتوضع ان کی نمایاں خصوصیت ہیں۔

آپ کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی محبین کا تانتا بندھ گیا، نماز جنازہ کے لئے مسجد کے پہلو کی زمین کافی نہ ہوئی تو دارالعلوم کے وسیع وعریض میدان میں نماز جنازہ ہوئی ،اعزہ واقارب ،دوست واحباب ، رشتہ داروں اور ملنے والوں کے جم غفیر نے آپ کے جنازہ کی مشایعت کی، خود ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اپنے تمام تر ضعف وپیرانہ سالی کے باوجود جنازہ کی نماز سے لے کر آخری آرام گاہ پہونچانے تک موجود رہے، اور بالآخر آپ ڈالی گنج کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

اسی طرح بہت سے مدارس ، جامعات اور کالجوں نے بھی ان کی وفات پر تعزیتی جلسے کئے اور مرحوم کی خدمات اور ستودہ صفات کا کھلے دل سے اعتراف کیا، اللہ آپ پر رحم فرمائے ،آپ کی خدمات قبول فرمائے، آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور آخرت میں بہتر سے بہتر بدلہ دے، آمین۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اذا مات ابن آدم انقطع عنه عمله الا من ثلاث : صدقة جارية أو علم ينتفع به ، أو وولد صالح يدعو له ۔ (جب ابن آدم کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال اس سے منقطع ہوجاتے ہیں، مگر تین چیزیں فائدہ پہونچاتی ہیں: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور ایسا لڑکا جو دعاء کرے۔)

اللہ اپنے دامن عفو میں آپ کو جگہ دے، آپ کی لغزشوں کو درگزر فرمائے، آپ کی کاوشوں کا خاطر خواہ بدلہ دے، اعزہ واقارب اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی: علمی وفکری شخصیت

الحمد لله رب العالمین، والصلاة والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین محمد وعلی آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین ، أما بعد :

بیسویں صدی عیسوی میں آسمان علم وفن پر جو ستارے طلوع ہوئے اور پورے جہاں کو روشن کیا، ان میں ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی کی شخصیت نمایاں ہے، وہ اگر چہ فلسطینی نژاد ہیں، لیکن امریکہ میں ان کی فکری اور علمی کاوشیں ظاہر ہوئیں، اس طرح پوری دنیا میں وہ ایک عظیم محقق اور مفکر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، ۱۹۲۱ء میں دنیائے فانی میں آئے اور ۱۹۸۶ء میں جام شہادت نوش کر کے ۶۵ رسال کی عمر میں دنیا کو الوداع کہا، إنا لله وإنا إلیه راجعون.

ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی نے اعلی تعلیم جامعہ ازہر قاہرہ میں حاصل کی، اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں سے استفادہ کیا، فلاڈلفیا امریکہ میں فلسفہ مذاہب کے پروفیسر رہے، شکاگو یونیورسٹی میں بھی کام کیا، اور اسلامی مطالعات کے موضوع پر ایک مکمل خاکہ پیش کیا، اور جدید علوم کو اسلامائزیشن کرنے کی طرف راغب ہوئے، اور اس میں اپنی شناخت قائم کی، اور مشہور ادارہ "المعهد العالمی للفکر الإسلامي" کے پہلے صدر قرار پائے۔

فکری شخصیت کے چند نقوش

ڈاکٹر اسماعیل راجی ایک فکری شخصیت کا نام ہے، ان کی اولین وابستگی اگر چہ زبان

وادب سے رہی، لیکن انہوں نے اپنا موضوع بدلا، اوراسلامیت کی طرف پوری توجہ کی، اس کے لئے تقریروتحریرکواستعمال کیا،توسیعی محاضرات وخطبات دیئے، تحقیقی مقالات تحریر کئے اورعلمی وفکری کتابیں تصنیف کیں، ان کی یہ کتابیں دو درجن سے بھی زیادہ ہیں، کچھ عربی میں ہیں، اور کچھ انگلش میں، ان میں ''الملل الیھودیۃ المعاصرۃ، أطلس الحضارۃ الاسلامیۃ، اسلامیۃ المعرفۃ، أدیان آسیا الکبری، الاسلام ومشکلۃ اسرائیل وغیرہ ہیں، انہوں نے خود اپنے افکارمیں بارے میں اظہارخیال کیاہے کہ'' يظن بعض الناس أن أفكاري من صنعي، ولكن كلما استشكل علي أمر أجد جوابه عند شيخ الاسلام ابن تيمية." (مقدمة أطلس الحضارة الإسلامية)

(۱) نوجوان طبقہ کا اعتماد اسلام اور دین پر بحال کرنا

ان کے نظریات میں نوجوان طبقہ کا اعتماد اسلام اور دین پر بحال کرنا تھا، ان کا اندازہ تھا کہ یورپین یلغار کے مقابلہ کے لئے اگر منصوبہ بند کوشش نہیں کی گئی، تو یہ عظیم سرمایہ ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، اورامت بڑے خسارہ میں مبتلا ہوگی، کیونکہ اس طبقہ میں اللہ کا تصور بھی ختم ہونے کے قریب ہے، الحاداور بے دینی نے اپنے پنجے گاڑ دئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں، مذہب نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں، یورپ اپنی عظیم ترقیوں کے باوجود دینی اور اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر ہے، اوراس زوال کا براہ راست نشانہ اہل ایمان کے سینے اوراسلام پسند نوجوان طبقہ کے سفینے ہیں، اس کے لئے انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ''جمعیۃ العلماء الاجتماعیین المسلمین'' کے نام سے طلباء کی ایک انجمن قائم کی، اس کے پیش نظران کا اسلام پسند نظریہ تھا: اسلامیۃ المعرفۃ (یعنی عصری علوم کا اسلام مائزیشن)، ڈاکٹر اسماعیل اس سوسائٹی کے صدر بھی رہے، اور وسیع پیمانہ پر کام کیا، یورپین دنیامیں طویل قیام کی وجہ سے جوفکری انحراف نوجوانوں میں سرایت کررہا تھا، اس کا

تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إن جيلنا هو الذى اكتشف هذا التنا قض عند ما عاشه فى حياته الفكرية، على أن العذاب النفسى الذى ولده هذا التناقض فينا جعلنا مرعوبين ومدركين تماماً ما تتعرضه الروح الاسلامية من انتهاك فى جامعات العالم الإسلامى، ولهذا فنحن ننبه العالم الإسلامى إلى هذا الشر، ونسعى لأول مرة فى التاريخ إلى تطويره خطة توقف سريانه وانتشاره، وتتصدى لنتائجه، وتعيد التعليم الإسلامى إلى نهجه الإسلامى.

(اسلامیۃ المعرفۃ: المبادیٔ العامۃ ص:۵۲)

(۲) تعلیم اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا ہتھیار:

تعلیم اس زمانہ کا سب سے اہم مسئلہ ہے، وہی ساری مشکلات کا علاج اور درد کا درماں ہے، اسلام نے اپنی وحی کا آغاز لفظ اقرأ سے کیا، اس سے تعلیم کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے، ڈاکٹر اسماعیل راجی بھی تعلیم کو ایک نا قابل تسخیر طاقت تصور کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تعلیم کو دینی اور دنیوی دو محاذوں اور شعبوں تقسیم کرنا اس کی افادیت اور نافعیت کو محدود کرنا ہے، جب تک اسی نظریہ پر عمل نہیں کیا جائے گا، ترقی کے صحیح امکانات سامنے نہیں آئیں گے۔

(۳) اسلام اور دوسرے مذاہب:

ڈاکٹر اسماعیل فارقی ادیان ومذاھب کے استاذ اور پروفیسر رہے، اس لئے انہوں نے تمام مذاہب کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا، ان کا نظریہ ہے کہ نبوت ایک ہمہ گیر ضرورت ہے، جو مرورِ زمانہ کے ساتھ پیش آتی رہی، اور اللہ تعالی کسی انسان کا محاسبہ اس

وقت تک نہیں کرتے، جب تک اس کے پاس نبی کی تعلیمات نہ پہونچ جائیں،بعض انبیاء وہ ہیں،جن کے نام قرآن میں موجود ہیں،اور بعض وہ ہیں جن کا تذکرہ نہیں آیا ہے،لیکن ان کے پیغام سے ان کے حالات سے واقفیت ہوسکتی ہے،اوران کا مرکزی پیغام اللہ کی بندگی اورعبادت ہے،اور بھلائی کے کام اور برائی سے اجتناب۔کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:إن الذين آمنوا والذين هادوا والنصارى والصابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحا فلهم أجرهم عند ربهم ولا خوف عليهم ولاهم يحزنون. (البقرة : ٦٢)

ڈاکٹر اسماعیل راجی کا کہنا ہے کہ اسلام سابقہ مذاھب کوتسلیم کرتا ہے،اوراس تسلیم واعتراف کی وجہ کلمۃ سواء (کلمۂ توحید) ہے،خاص طور سے یہودیت ونصرانیت دونوں آسمانی مذاہب ہیں، جو وحی الٰہی کے ذریعہ سے آئے۔خلاصہ یہ کہ اسلام کا انسان کے حوالہ سے نظریہ تین بنیادوں پر مشتمل ہے: (ا)دین فطرت میں یکسانیت (۲) وحی شروع ہی انسانوں کی ضرورت رہی ہے(۳) تینوں مذاہب میں وجہ مماثلت یہ ہے کہ ان کی اساس توحید ہے۔

ان کے نمایاں افکارحسب ذیل ہیں:

(ا) عالمی مذاہب اور بین المذاہب مذکرات

(۲) سماجی علوم کی ترتیب وتدوین

(۳) انگریزی زبان کواسلامی آہنگ دینا

(۴) اسلام کا ثقافتی اٹلس

ڈاکٹرمنظورعالم صاحب اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

”اسماعیل راجی فاروقی نے تعلیم پرتوجہ دینے کے ساتھ ساتھ سماجی علوم کو بھی غایت درجہ اہمیت دی، وہ اس حقیقت کواچھی طرح سمجھتے تھے کہ آج کی دنیا

میں سماجی علوم ہی اصل علوم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اسلام کے پاس سماجی علوم کی ترتیب وتدوین اوران کی رہنمائی کے لئے اعلی ترین علمی مواد موجود ہے، لیکن مسلم علماء ودانشوران سماجی علوم پر وہ توجہ نہیں دے پارہے ہیں، جس کے یہ علوم مستحق ہیں، انہوں نے ایک کام یہ بھی کیا کہ انگریزی زبان کواسلامی رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ انہوں نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ جواسلامی اصطلاحات قرآن وحدیث اور دوسرے اسلامی مآخذ میں استعمال ہوئی ہیں، انھیں اسی طرح استعمال کیا جائے“۔

افرادسازی میں ڈاکٹر اسماعیل راجی کا امتیاز

اسماعیل راجی کی شخصیت اپنے تلامذہ کے لئے اور دیگر افراد کے لئے پرکشش تھی، وہ اپنی فکر کی بنیاد پر ایک حلقہ میں اثر انداز تھے، لوگ ان کی فکر سے متأثر ہوکران کا ساتھ دیتے اوراس کی نشرواشاعت میں حصہ لیتے، ان کی فکر عالمی سطح پر عام ہوئی، مختلف ملکوں میں اس کے حاملین تیار ہوئے، گویا انہوں نے اپنے روز وشب کے معمولات میں افرادسازی کو بھی اہمیت دی، ان کے نامور تلامذہ میں شیخ عبدالحمید ابوسلیمان، شیخ طہ جابر علوانی، شیخ زین ابراہیم، شیخ عمر کاسولے وغیرہ ہیں، جوان کے افکار کے صحیح ترجمان اوران کے نظریے کے شارح قرار دئے جاسکتے ہیں، اور یہ بذات خود اسلامی فکر کے حامل اورکئی نسلوں کے مربی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی:

مفکر اسلام حضرت مولاناؒ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے یورپ کے کئی اسفار کئے، ١٩٦١ء میں انگلینڈ پہلی بار تشریف لے گئے، ١٩٦٣ء میں جنیوا بھی تشریف لے گئے، پھر متعدد بار جنیوا جانا ہوا، جس میں رفیق سفر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تھے، اس طرح لندن اور بلجیکا کا دعوتی سفر ١٨/ اکتوبر ١٩٨٥ء وہاں کے بعض محبین خاص طور سے

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی دعوت پر کیا، اور وہاں ایک علمی وتحقیقی ادارہ کے جلسہ انتظامیہ میں شرکت کی، فلاڈلفیا یونورسٹی میں صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز ڈاکٹر اسماعیل راجی سے مولانا کی ملاقات ہوئی۔ (کاروان زندگی: ج۲ /۸۰۔۸۳)۔

اختتامیہ:

ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی ایک اہم علمی وفکری شخصیت کے مالک تھے، ان کے ذریعہ دیار غیر میں اسلامی تہذیب وثقافت کی اشاعت، اور علوم اسلامی کے فروغ کا کام انجام پایا، انہوں نے اپنے علاقہ فلسطین کو اسلام کی خاطر خیر باد کہا، اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ بلاشبہ وہ اپنے خدمات کی بنا پر ہمیشہ یاد کئے جائیں گے اور نسلیں ان سے مستفید ہوں گی۔

فؤاد سیزگین: میدان علم وتحقیق کے عظیم محقق

عالم اسلام میں علم وتحقیق اور محققین:

علم وتحقیق دونوں لازم وملزوم ہیں، اسلام کی نظر میں وہی علم معتبر ہے، جو مستند اور درجۂ تحقیق تک پہونچا ہوا ہو، اگر وہ شک وارتیاب، اور ظن وتخمین کے درجہ میں ہے، تو وہ جہل اور ناواقفیت کی علامت ہے، انیسویں صدی عیسوی میں مستشرقین کی سازشوں کی بنا پر علمی دنیا میں بے شمار شکوک وشبہات اور اعتراضات وجود میں آئے، اس طبقہ نے صرف تاریخ وسیرت ہی کو اپنا نشانہ نہیں بنایا، بلکہ مصادر شریعت پر بھی حملہ کیا، اس سے عوام تو عوام، خواص کے ذہن بھی فکری ارتداد کا شکار ہو گئے، اور ان کا اعتماد اسلامی علوم پر کمزور پڑ گیا، اُس وقت عالم اسلام کے مختلف حصوں میں اسلامی محققین نے محاذ سنبھالا، اور بے بنیاد اور بے حقیقت باتوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا، اور ہر بات کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر آئندہ کے لئے ایک اچھی نظیر قائم کر دی، اس سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے سیرت نبوی، سیرت صحابہ وصحابیات، اور تاریخ اسلام کی نامور شخصیات اور اہم واقعات سے متعلق لگائے ہوئے الزامات کا مسکت جواب دیا، اس سلسلہ میں ان کے رسائل (الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ فی الاسلام) وغیرہ کا مطالعہ دلیل کے لئے کافی ہے۔ ان کے اس مشن کو دیگر علماء اور اہل تحقیق نے اس کو مزید آگے بڑھایا، ان میں محدث کبیر علامہ حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ اور ڈاکٹر فؤاد سیزگینؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فؤاد سیزگین: ایک سوانحی خاکہ

ڈاکٹر فؤاد سیزگین ایک نامور محقق اور عظیم شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے ترکی

کی سرزمین پر۲۴؍اکتوبر ۱۹۲۴ءکوآنکھیں کھولیں، ان کا گھرانہ علمی تھا، ان کے والد محمد سزگین محکمہ قضاء سے متعلق تھے، بعد میں تدریسی عمل اختیار کرلیا تھا، فؤادسیزگین ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد استانبول گئے، اور وہاں کے اصحاب علم وفضل سے استفادہ کیا، دوران طالب علمی ایک مرتبہ ان کے جرمن استاذ پروفیسر ہیلمٹ رِٹر (Helmut Ritter) نے پوچھا کہ تم کتنے گھنٹے پڑھتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: تیرہ گھنٹے، اس پر انہوں نے کہا: پھر تم سائنس داں نہیں بن سکتے، اس کے بعد انہوں نے اپنے روز وشب کے اٹھارہ گھنٹے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کرائے اور ایک عبقری شخصیت بن کرابھرے، بعض حالات کی وجہ سے ترکی سے ان کو جرمن منتقل ہونا پڑا اور وہاں جاکر اپنا علمی سفر جاری رکھا اور اسلامی کتب خانہ کو اپنے نگارشات اور تحقیقات سے مالامال کیا۔

عام طور پر یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ’’مصادر الإمام البخاری‘‘ کے موضوع پر ۱۹۵۴ء میں پی ایچ ڈی کی، لیکن بعض حضرات نے ابوعبیدہ کی کتاب ’’مجاز القرآن‘‘ کو ان کی ڈاکٹریٹ کا موضوع بتایا ہے، اور یہ عمل ۱۹۵۱ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد وہ استانبول یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کئے گئے، اور عمر کے آخری مرحلہ تک تدریسی زندگی میں مشغول رہے، اورانہوں نے علم وتحقیق سے معمور زندگی گذاری، اور اپنے پیچھے تصنیفات کا ایک بڑا سرمایہ چھوڑا۔ اس کی وجہ سے ان کو "مكتشف الكنز المفقود" کہا جاتا ہے۔ ان کے علمی کاموں کے پیش نظر ان کوئی ایوارڈز (Awards) سرفراز کیا گیا، جن میں شاہ فیصل ایوارڈ قابل ذکر ہے۔ اس طرح انہوں نے علم وتحقیق سے معمور زندگی گذاری، بالآخر ۳۰؍جون ۲۰۱۸ء میں استانبول میں دارفانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علمی وتاریخی کارنامے:

فؤادسیزگین کی علمی زندگی قابل رشک کارناموں سے لبریز ہے، ان کے کاموں

کی نوعیت دوطرح کی ہے: ایک ادارہ جاتی پروگرام، تو دوسری تصنیفی اور تحقیقی کام کی:

ادارہ جاتی پروگراموں میں معہد تاریخ العلوم العربیۃ والاسلامیہ کا قیام ہے، یہ ادارہ فرینکفرٹ کی گویٹے یونیورسٹی میں ۱۸ رمئی ۱۹۸۲ء سے قائم ہے، اس ادارہ کے قائم کر نے سے جہاں فؤاد سیزگین کی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے وہیں ان کی انتظامی خوبیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں، انہوں نے اس کے ذریعہ مسلمانوں میں مختلف علوم میں درجۂ اولیت اور بلکہ اکتشافی صلاحیت (نئی دریافت) کا اندازہ ہوتا ہے، مسلمان ہی وہ اولین عنصر ہیں، جنہوں نے عربی اور اسلامی علوم میں اپنے گہرے نقوش ثبت کیئے اور ایک پوری دنیا کو مالا مال کیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادارہ سازی اور اس کے نظام چلانے میں کس قدر محنت کوشی اور خون پسینہ بہانے کی ضرورت پڑتی ہے، فؤاد سیزگین کی قوت ارادہ کی مضبوطی اور استحکام کہیئے کہ انہوں نے کسی قسم کی پژمردگی اور ضعف کو اپنے اندر داخل ہو نے کی اجازت نہیں دی، اور بڑی حوصلہ مندی اور قوت عمل کے ساتھ اس کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، یہ ان کی اوالعزمی کی دلیل ہے۔

تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں ایک نمایاں کام تاریخ التراث العربی (عربوں کی میراث علمی کی تاریخ) ہے، یہ فؤاد سیزگین کی اہم کتاب ہے، یہ سترہ جلدوں میں ہے، بلکہ اٹھارویں جلد زیر ترتیب تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا، اس کا آغاز ۱۹۸۳ء میں ہوا، انہوں نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابتداء میں ان کا منصوبہ کارل بروکلمان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ کے ملحق لکھنے کا تھا، وقت گذرنے کے ساتھ انہوں نے سوچا کہ بہتر ہوگا کہ اس کتاب کو نئے انداز سے مرتب کیا جائے، لیکن بعد میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ عربی زبان میں جن علوم پر لکھا گیا ہے، ان کی تاریخ لکھی جائے، اور اس موضوع کو زیر بحث لانے کے لئے مخطوطات اور مطبوعات کا احاطہ کیا جائے، چنانچہ یہ کتاب مرتب ہوئی اور تحقیقی اور علمی انداز

میں مرتب ہوکر سامنے آئی۔

ان کے علمی کاموں میں خطبات ومحاضرات بھی ہیں، جوانہوں نے متعدد یونیورسٹیوں میں دیئے ہیں، انہوں نے جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ میں ۱۹۷۹ء محاضرات دیئے، یہ محاضرات فی تاریخ العلوم کے نام سے شائع ہوئے ہیں، پاکستان سے ان کا ترجمہ ڈاکٹر خورشید رضوی نے ''تاریخ علوم میں تہذیب اسلام کا مقام'' کے نام سے ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الأقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد سے شائع کیا۔

فؤاد سیزگین کا ایک اہم کام ''مجلۃ تاریخ العلوم العربیۃ'' کا اجراء ہے، یہ مجلّہ علمی اور تحقیقی رنگ میں ۱۹۸۴ء میں منظر عام پر آیا، یہ سالانہ کثیر لسانی مجلّہ ہے، انگریزی، جرمن، فرانسیسی اور عربی زبانوں میں یہ مقالات شائع ہوئے ہیں۔

اختتامیہ: (خلاصۂ کلام)

خلاصہ یہ کہ فؤاد سیزگین نے عالم اسلام میں علمی اور تحقیقی فضاء قائم کی، اور اپنے کاموں، نیز شاگردوں کے ذریعہ اسلامی تراث (ورثے) کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا، ان کی حیات وخدمات کا صحیح خراج عقیدت یہی ہے کہ ان کے جاری کئے ہوئے مشن کو آگے بڑھایا جائے اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز اور اس کے روح رواں محترم گرامی جناب ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ وہ اس طرح کے علمی موضوعات پر سال میں کئی پروگرام اور سمینار منعقد کرتے رہتے ہیں، فؤاد سیزگین پر منعقد یہ سمینار ان کے علمی ذوق اور افراد سازی، نیز سلف کی قدردانی کی دلیل ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کو مزید ہمت وحوصلہ عطا فرماتے رہیں تاکہ ان کا یہ فیض عام عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائے۔

ڈاکٹر الحاج علی ملپا: مشائخ کے منظور نظر

کسی ایسی شخصیت کا تعارف پیش کرنا جو دوسروں کے لئے ہر اعتبار سے باعث خیراور زندگی کے ہر گوشے میں نصیحت کا پہلو رکھتی ہو ایک بڑی دینی اور انسانی خدمت ہے، تاریخ اسلام میں ایسی شخصیات کا ذکر اوران کی زندگی کی تفصیلات مذکور ہیں، جن کو پڑھ کر انسانیت کا صحیح اور سچا پیغام ملتا ہے، اوران سے انسانی زندگی کے لئے مختلف نوعیت کے سبق اور عبرت کا حصول آسان ہو جا تا ہے۔

ہر معاشرہ میں ایسے قابل قدر لوگ پائے گئے ہیں، جن کی عظمت، دینداری، بلند اخلاقی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، انھیں شخصیتوں میں جنوبی ہند کے صوبہ کرناٹک کے شہر بھٹکل میں ڈاکٹر علی ملپا صاحب رحمہ اللہ نے ایک مثالی زندگی گزاری، انہوں نے سچی دینداری، اور قابل تقلید زندگی کا نمونہ پیش کیا، وہ اگر چہ بہت بڑے عالم دین نہیں تھے، لیکن علمائے دین کی شان اور دینداری وتقوی میں اپنی مثال آپ تھے، اپنے زمانے کے تمام اہل علم ومعرفت سے انہوں نے استفادہ کیا، اوراخیر میں وہ حضرت تھانویؒ کے طریقۂ تعلیم وتربیت سے وابستہ ہوئے، اوراخیر تک دینداری، خیر خواہی، تقوی، اور علوم اسلامیہ کے تعلیمی حلقے کو وسیع تر کرنے کے سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ کا تصوران کے اوران کے مخلص رفقاء کے ذہن میں ابھرا، اوراسے عملی شکل دلانے کے لئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور دیگر اپنے خاص تعلق والے علماء اور جناب محی الدین صاحب منیری رحمہ اللہ اورشہر بھٹکل کے سر براہ دوستوں کے مشورہ سے بھٹکل میں قائم کرنے میں بڑا حصہ لیا، اوراس کی مجلس انتظامیہ کے سر براہ ممبر کی حیثیت سے کام کرنے میں ان کو ایک قسم کی سبقت حاصل تھی۔

ڈاکٹر الحاج علی ملپا رحمہ اللہ کو اللہ تعالی نے وہ قلب سلیم عطا فرمایا تھا کہ بحرِ عرب کے ساحلی علاقے بھٹکل اور اس کے نواحی علاقوں میں علم دین کی شمع کرنے کے لئے وہ ایک بیقراری میں مبتلا تھے، اور اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کے لئے انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا، اور معرفت الٰہی کے حصول کے لئے وہ بہت سی مقدس ہستیوں کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز فکر وتربیت میں اپنے لئے ایک کشش محسوس کرتے تھے، اور اسی طرز فکر کو اختیار کرنے کے لئے انھوں نے بزرگان دین اور اصحاب علم ومعرفت کے دامن سے وابستہ ہونا ضروری سمجھا، اور اللہ تعالی نے ان کے مخلصانہ طلب وجستجو کو برگ وبار عطا کیا، اور ان کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے جانشینوں سے کسب فیض کے قیمتی مواقع حاصل ہوئے۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری کی خدمت میں حاضری دی، اور ان کے دریائے علم ومعرفت سے دامن بھرا، اور اسی جذبۂ تربیت سے استفادہ کر کے علم وعمل کے میدان کو اپنے علاقہ میں وسیع کرنے کے لئے ایک دینی مکتب جو بھٹکل میں پہلے سے مختصر پیمانے پر قائم تھا، اس کو وسیع کرنے اور اس کو ایک بڑی اسلامی تربیتی درسگاہ بنانے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کیں، اور بھٹکل کے مشہور صاحب فکر اور دینی تعلیم کی نشرواشاعت کے داعی، الحاج جناب محی الدین منیری صاحب جو اپنی دینی اور دعوتی کوششوں میں مشغول اور معروف تھے ان کے ساتھ مل کر جناب ڈاکٹر ملپا صاحب مرحوم نے بھٹکل میں اس عظیم الشان درس گاہ کی بڑے پیمانے پر بنیاد رکھی، جو ہندوستان کے قدیم اور اعلی پیمانے کے مدرسوں میں شمار ہوسکے، اور اس کا سنگ بنیاد مرشد العالم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) سنہ ۱۹۶۰ء میں رکھوایا، پھر حضرت والا کی خاص توجہات اور دعاؤں سے اس کو جامعہ اسلامیہ بھٹکل بننے اور عملی طور سے ایک عظیم تعلیم گاہ ہونے کے ساتھ پورے علاقہ میں تربیتی مرکز ہونے کا شرف حاصل ہوا، اور

حضرت ملپا صاحب مرحوم کی فکر وکوشش سے تمام بزرگان علم ومعرفت کو وہاں پہونچ کر دعادینے اوراپنے افادات سے وہاں کے عوام وخواص کومستفید کرنے کا موقع ملا۔

حضرت عارف باللہ مولانا شیخ ابرارالحق صاحب حقی آخری خلیفہ حضرت تھانوی (رحمہما اللہ تعالیٰ) حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ العالی ، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کبار علماء نے حضرۃ العلامۃ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی معیت میں وہاں جاکر علم ودعوت کی روشنی پھیلانے میں حصہ لیا، خاص طور سے مرشد الملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء) بار بار جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی دعوت پر تشریف وہاں لے گئے،اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

جامعہ اسلامیہ کا فیض ہے کہ وہاں مولانا ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی ، اور عظیم مرکز اسلامی قائم ہے، جو داعی الی اللہ عالم باعمل مولانا محمد الیاس ندوی حفظہ اللہ تعالی نے قائم کیا ہے، اور یہ دونوں ادارے حضرت علامہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں دعوتی، تعلیمی ،اور تحقیقی میدان میں پوری طرح روح مقصدیت کے ساتھ رواں دواں ہیں، بلاشبہ ان تمام دعوتی، تعلیمی، تربیتی سرگرمیوں میں مرحوم حضرت الحاج علی ملپا رحمۃ اللہ علیہ کا ہر اعتبار سے بڑا حصہ ہے، انھوں نے دعوت وتربیت کے میدان میں اپنی پوری عمر گذاری، اور وہ دین ودنیا کی سعادت وکامرانی کا ایک بڑا اور بیش قیمت حصہ اپنی متاع وراثت کے طور پر چھوڑ گئے۔ رحمه الله تعالى رحمة واسعة، وتغمده بالمغفر وأكرم بالجنات والنعيم.

داعی الی اللہ مولانا غزالی خطیب ندویؒ

اخلاص وعمل کے پیکر

دعوتی اور علمی حلقوں میں یہ خبر بہت محسوس کی گئی کہ اخلاص وعمل کے پیکراور داعی مولانا محمد غزالی خطیب ندوی مؤرخہ ۲۳ ر رمضان ۱۴۳۹ھ مطابق ۷ جون ۲۰۱۸ء کو رمضان کی آخری عشرہ کی طاق رات میں اللہ کو پیارے ہوگئے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا غزالیؒ نے مرکز نظام الدین میں رہ کر ایک قابل رشک زندگی گذاری، ان کی طبیعت میں خاموشی تھی، اس لحاظ سے انہوں میں اخلاص کے ساتھ راہ حق کے طلب گاروں کی رہنمائی کی اور نام ونمود سے ہمیشہ اپنے کو دور رکھا، اس کے لئے اپنے وطن بھٹکل کو چھوڑا، اور مستقل مرکز میں قیام کیا، حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کے زمانہ سے وہ مرکز نظام الدین سے وابستہ ہوئے، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو محسوس کیا، اور یکسوئی کے ساتھ اس مشن میں مشغول رہنے کی نصیحت کی، ماشاء اللہ مولانا غزالی اس کے پابند رہے اور زندگی کی آخری سانس تک یہ وابستگی قائم رہی۔

مولانا غزالی کا سنہ ولادت ۱۹۴۴ء ہے، وہ کرناٹک کے مشہور شہر بھٹکل میں پیدا ہوئے، دار العلوم ندوۃ العلماء کی اہم اور معتبر شاخ جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء مزید تعلیم کے لئے آئے، اور ۱۹۶۷ء میں اس فارغ ہوئے، اور عالمیت کی سند حاصل کی، فراغت کے بعد انھیں بتوفیق الٰہی مرکز نظام الدین میں کام کرنے کا موقع ملا، لیکن اپنے مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء سے ان کی وابستگی میں کوئی کمی نہیں آئی، وہ وقتاً فوقتاً یہاں آتے، اور ان کو مجلس انتظامیہ کا رکن بھی منتخب کیا گیا تھا،

جس کی وجہ وہ ہر سال ندوہ آتے تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ سے مولانا غزالیؒ کا براہ راست تعلق رہا، ان کی حیات میں ان سے استفادہ کے لئے برابر آتے رہے، اور ان کی تصنیفات اور کتابوں کو پھیلاتے رہے، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ رہا، عقیدت مندانہ حاضری اور استفادہ کی کوشش، اسی کے ساتھ دیگر اساتذہ سے بھی ان کا تعلق برابر قائم رہا، ان کے احترام اور عزت میں کوئی کمی نہیں کرتے، بلکہ ان کے ساتھ گذرے ہوئے لمحات کا تذکرہ کرتے، اور جذبہ احسان شناسی کا اظہار کرتے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے ساتھ دعوت کا امتزاج شروع ہی سے ہے، اشاعت اسلام اس کے اہم مقاصد میں سے ہے، عربی زبان کے علاوہ کئی مقامی زبانوں کی تحصیل اسی جذبہ کے پیش نظر ہے، ابتدائی دور میں سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم دعوتی مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کے لئے تھی، اب بھی ماشاءاللہ تعلیم نظام میں صحافت ولسانیات کا شعبہ ہے، جس میں دعوتی مقاصد کے لئے زبانیں سکھائی جاتی ہیں اور ان میں مہارت پیدا کی جاتی ہے، ماشاءاللہ دار العلوم کے طلباء تعلیم کے ساتھ دعوت میں بھی اپنا وقت لگاتے ہیں، خاص طور سے تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں اور معمولات کے لئے طلباء کی بڑی تعداد ہفتہ میں ایک دن، بڑی تعطیلات میں کچھ ایام فارغ کرتی ہے، اور فراغت کے بعد ایک سال بھی بعض طلباء لگاتے ہیں۔ اس دعوتی مشن کی نگرانی دار العلوم کے اساتذہ کرتے ہیں، اور سال میں مرکز نظام الدین سے ایک وفد بھی آتا ہے، جو سال بھر کی کارگذاریوں کو سن کر مفید مشورے دیتا ہے، مولانا غزالی مرکز کے سالانہ وفد میں پابندی سے آتے تھے، اور اس کو اپنے لئے سعادت وشرف سمجھتے، ملاقاتوں میں اس کا تذکرہ کرتے، اور طلباء کو عام خطاب بھی کرتے تھے، اسی طرح کام کرنے والوں کو مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔

دعوت جلوت کی چیز ہے،اس میں داخل ہونے کے لئے بنیادی شرائط کی بجا آوری ضروری ہوتی ہے،مولانا غزالی نے اپنے جذبۂ اخلاص سے اس دعوت کام کو آگے بڑھایا اور عوام وخواص دونوں کے منظورنظر بن گئے،خدرحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

وہ رمضان میں اپنے وطن بھٹکل گئے تھے کہ وقت موعود آ گیا اور وہ راہی آخرت ہو گئے ۔ان کی وفات دعوت وتبلیغ کے میدان میں خسارہ تصور کی گئی ، اللہ تعالی ان کی کوششوں کو قبول فرمائیں اوران پر رحمت وعنایت کی بارش نازل فرمائیں اوران کو جنت الفردوس کے اعلی سے اعلی مقام میں جگہ عطافرمائیں،اوران کے پسماندگان اوراہل وعیال کوصبرجمیل عطافرمائیں۔

مولانا عبداللہ عبدالتواب مدنیؒ

کامیاب داعی اور ماہر تعلیم

جامعہ سلفیہ بنارس نے ۴-۵-۶ اپریل ۱۹۸۶ء مطابق ۲۳-۲۵ رجب ۱۴۰۶ھ کو ایک علمی سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، چونکہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ایک پروگرام میں شرکت کرنی تھی، اس لئے انہوں نے مجھ کو نمائندہ بنا کر اس سیمینار میں شرکت کا حکم دیا، میں نے جامعہ سلفیہ کے پروگرام میں شرکت کا ارادہ کرلیا، اگر چہ وہاں کے ذمہ داروں نے براہ راست مجھ کو دعوت بھی دی تھی، سیمینار میں پڑھنے کے لئے ایک مضمون ''ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی عربی زبان کے مشہور علماء اور مصنفین'' تیار کرلیا تھا، جس کو سمینار میں پڑھنے کا موقع ملا، اس سمینار میں ہندوستان کے مدارس اسلامیہ اور یونیورسٹیوں کے فضلاء اور علم و دانش کی قابل ذکر شخصیات شریک ہوئیں، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ کا وفد بھی ڈاکٹر عبد اللہ بن عبدالمحسن ترکی کی سربراہی میں شریک ہوا، اس وفد میں محمد بن عبدالمحسن ترکی، عبدالحلیم عبدالفتاح عویس، دکتور محمد شوقی شریک ہوئے، اس طرح یہ سمینار ایک علمی سمینار بن گیا۔

سمینار کے ختم ہونے کے دوسرے دن صبح کو بنارس سے کاٹھمنڈو تک ہوائی جہاز سے سفر ہوا، میں نے سفر سے پہلے والی رات مفتی عبدالباسط بنارسی کے مہمان خانہ میں گذاری، انہوں نے میرا بہت اکرام کیا، اس لئے کہ ان کے والد ماجد مولانا محمد اسحاق بنارسی سے میرا بھی تعلق تھا، انہوں نے مجھے بنارس ایئر پورٹ پر پہونچا دیا، اور میں انڈین ایرلائن کے جہاز سے کاٹھمنڈو کے لئے روانہ ہوگیا، میں نے متفکر تھا کہ اگر میرا تار مولوی

حنیف ندوی (نیپال) کونہیں پہونچا ہوگا تو وہاں پہنچ کر دشواری ہوگی ، تار تو وہاں نہیں پہونچا، لیکن اللہ تعالی نے راستہ ہی میں ایک رفیق سفر کا غیب سے انتظام ہوگیا، اور وہ تھے مولانا عبداللہ بن عبد التواب مدنی ، وہ کاٹھمنڈو میں دارالافتاء مملکت عربیہ سعودیہ کے مبعوث اور نیپال میں جملہ داعیوں کے نگراں تھے، مجھ ناتواں بندے پر اللہ تعالی کا خاص فضل تھا، ان کی قیام گاہ کاٹھمنڈو میں تھی ، اس لئے وہاں پہونچ کر سیدھے میں ان کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر گیا، اور مولوی محمد حنیف کو تار نہ ملنے کی وجہ سے سخت بےچینی تھی ،مولانا عبداللہ مدنی کی وجہ سے مجھے اس پورے سفر میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوئی ، اور کئی پروگراموں میں شرکت ہوئی۔

کاٹھمنڈو سے براٹ نگر بذریعہ جانا ہوا، ہوائی جہاز میں میرے ساتھ مولوی محمد حنیف ندوی ،مولانا عبداللہ عبد التواب مدنی اور مولوی محمد علی ندوی تھے ، براٹ نگر سے مدرسۃ الاصلاح گئے ، وہاں کے پروگرام میں شرکت کی ،مولانا عبداللہ مدنی نے اس میں مؤثر تقریر کی ، اسی طرح دارالعلوم نورالاسلام جلپا پور کے پروگرام میں بھی میں نے ’’عجمی ممالک میں عربی زبان کی تعلیم کیوں؟ کے موضوع پر تقریر کی ،مولانا عبداللہ مدنی نے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا، جنک پور بھی جانا ہوا، وہاں جامعہ سلفیہ کو بھی دیکھا، اس بت پرستانہ ماحول میں اس ادارہ کا قیام ایک امداد غیبی سے کم نہیں، یہاں تک مولانا عبداللہ مدنی کا ساتھ رہا، دوران سفر انہوں نے ہر طرح سہولت فراہم کی۔

مولانا عبداللہ مدنی سے پہلا تعارف ایک داعی اور اللہ کے راستہ کے مجاہد کی حیثیت سے ہوا، وہ توحید وسنت کے علمبردار اور حق وصداقت کے نقیب تھے، اللہ تعالی انہیں ایک طرف تقریری صلاحیتوں سے نوازا تھا تو دوسری طرح تحریری لیاقتوں سے بھی مالا مال کیا تھا، وہ ان دونوں ذرائع کو خدمت اسلام کے لئے وقف کئے ہوئے تھے، وہ جمعہ کے خطبوں، عام جلسوں اور خصوصی ملاقاتوں میں کتاب وسنت کی بات کرتے ،اور انہی دونوں

سرچشموں سے عوام وخواص کو جوڑتے تھے،اس کے لئے انہوں نے ماہنامہ ’’نورتوحید‘‘ کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا،اوراس رسالہ کے جاری ہونے سے اسلام کی دعوت کو پہونچانا مزید آسان ہوگیا۔ ماشاء اللہ ۲۵ ؍سے زائد سال سے یہ رسالہ دین اسلام کی خدمت کررہاہے اورشمع توحیدکوفروزاں کیئے ہوئے ہے۔۱۲؍ربیع الأول ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۲؍دسمبر ۲۰۱۷ء کوتوحید وسنت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔حادثہ کی خبرسن کر بڑی حیرت ہوئی کہ انہیں ابھی دعوت کے میدان میں بہت کام انجام دینے تھے،لیکن اللہ کے فیصلہ کے سامنے سرِتسلیم خم کرناپڑاکہ اللہ تعالی ان کے اخلاف کی شکل میں ان کانعم البدل ملک نیپال کومقدرفرمائے۔

مولانا عبداللہ مدنی ملک نیپال کے نمایاں علماء میں تھے،انہوں نے تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی، پھروہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گئے، جہاں مزید تعلیم حاصل کی،اوردارالافتاء کے مندوب کی حیثیت سے نیپال میں دعوتی کاموں میں مشغول رہے،ان کا ماننا تھا کہ معاشرہ انسانی کی تعمیر میں خواتین کا اہم کردار ہے،خواتین میں اگر تعلیم انقلاب آئے تو معاشرہ بہت جلد صحیح رخ پر آئے گا، اللہ کی توفیق سے انہوں نے مدرسہ خدیجہ الکبری للبنات کا آغاز کیا، ماشاء اللہ بہت کم مدت میں اس مدرسہ نے پورے ملک نیپال میں اپنی جگہ بنالی،اور بے شمارلڑکیوں کتاب وسنت کی تعلیم سے آراستہ ہوکر نکلیں،اس طرح بہت کم دنوں میں یہ جامعہ خدیجۃ الکبری جھنڈانگر کے نام سے مشہور ہو گیا، میں نے ابتدائی زمانہ میں اس ادارہ کودیکھاہے،مولانا عبداللہ مدنی اس کے ناظم اعلی تھے،اسی کے ساتھ جمعیت اہل حدیث نیپال کے اہم ذمہ داروں میں تھے، وہ کانفرنسوں اورسیمیناروں میں جمعیت کے اہم نمائندہ ہوتے تھے،اورمرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند سے بھی ان کے روابط مستحکم تھے،اوراس کے ناظم عمومی شیخ اصغرعلی امام مہدی حفظہ اللہ وتولاہ سے بھی بہت گہرے تعلقات تھے، یہ کسی کونہیں معلوم تھا کہ وہ بہت جلد دارفانی کی طرف

کوچ کر جائیں گے، لیکن اللہ تعالی کی حکمتیں انسانوں کے نفع اور فائدہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تمام کاموں میں نشیط اور فعال رہے۔ اس وقت ان کے تمام کاموں کی انجام دہی ان کے برادر عزیز مولانا عبدالعظیم مدنی کے ذمہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے اعمال کو قبول فرمائیں، اور ان پر باران رحمت نازل فرمائیں اور ان کی لغزشوں کو درگذر فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلی سے اعلی مقام میں جگہ عطا فرمائین اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

آہ! کرنل محسن جلیل شمسیؒ

اخیر جنوری ۱۹۵۹ء میں بغداد میں اپنے تعلیمی نصاب کو پورا کر کے واپس آیا تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد محبؒ مخلص محترم مولانا سید محمد الحسنیؒ نے اپنی دعوتی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے کی تجویز رکھی اور بالخصوص عرب نوجوانوں کو دعوتی حیثیت سے مخاطب کرنے اور ان کے اندر دعوتی روح پیدا کرنے کے لئے ایک رابطہ مہم کے طور پر ''الرابطۃ الاسلامیۃ الدولیۃ'' کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی، بعد میں اس کے اندر مزید وسعت پیدا کرنے کے لئے ہندوستان کے بڑے اداروں کے طلبہ کو بھی مخاطب کرنے کی اسکیم کا فیصلہ ہوا اور اس کی ابتداء لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے مسلم طلبہ سے کرنے پر اتفاق ہوا۔

اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی مرحوم کے مشورے سے ان کے ذریعہ میڈیکل کالج لکھنؤ میں بعض ہونہار مسلم طلبہ کی ایک فہرست تیار کی گئی اور اس میں سرفہرست ضلع گونڈہ کے محسن شمسی کا نام تھا، ڈاکٹر قریشی کی معرفت ان سے ملاقات کی گئی اور اس دعوتی سرگرمی کا تعارف کرایا گیا، انہوں نے اس پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور فوری طور پر میڈیکل کالج کے مسلم طلبہ میں رابطہ اسلامی کے نام سے دعوتی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور رابطہ کے دفتر میں پہلی نشست منعقد ہوئی، اس میں ڈاکٹر قریشی صاحب اور ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب، اور غالباً ڈاکٹر محمد اطہر صاحب (معتمد مالیات ندوۃ العلماء) اسلامیہ کالج لکھنؤ کی طرف سے شریک تھے۔

رابطہ اسلامی کی سرگرمیوں میں ڈاکٹر محسن شمسی صاحب نے ایک اہم مقصد سمجھ کر بہت حصہ لیا اور بہت سے نامانوس طلبہ کو رابطہ کی سرگرمیوں میں شریک کر لیا اور اس سے میڈیکل کالج کے پورے ماحول پر اثر پڑا، اور اس کی شہرت دوسرے کالجوں اور اداروں

کے طلبہ میں بھی ہوئی ،اور دعوتی کوشش کے لئے رابطہ کا قیام ایک اشارۂ غیبی محسوس ہوا، رابطہ کے بانی مولانا محمد الحسنی صاحبؒ چاہتے تھے کہ اس کی ایک اچھی عمارت ہو اور اس کام کو اور زیادہ پھیلانے کا موقع ملے، اس لئے انھوں نے رابطہ کا تعارف نامہ عربی میں تیار کر کے اپنے تعلق والے باہر کے بعض حضرات کو بھیجا اور اس کے مقصد کو واضح طور پر بیان کر کے ان کی رائے معلوم کی، الحمد للہ اچھا تأثر لوگوں نے پیش کیا، اس لئے اس کی مقصدیت کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے ایک خبر نامہ (Bulletin) عربی انگریزی میں شائع کر کے عرب نو جوان اور باہر کے اہل دعوت کو بھیجا گیا، اس کا اثر اچھا ہوا اور مسلسل کئی خبر نامے شائع ہوئے ،اس کے لئے البعث الاسلامی کے دفتر سے الگ ایک دفتر قائم کیا گیا اور وہاں ہر ہفتہ یہاں کے طلبہ اور دعوتی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کا خاص اجتماع، کام کی رفتار تیز کرنے کے لئے کیا جاتا رہا، اس کے کام کے خاکے کو عملی شکل دینے کے لئے ایک اردو پمفلٹ بھی شائع کیا گیا، اس کام میں ڈاکٹر قریشی کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندویؒ کی تائید حوصلہ افزائی کا باعث بنی، رابطہ کے کام کو آگے بڑھانے اور اس کے لئے ایک مستقل عمارت قائم کرنے کے لئے پروگرام بنا تو ہندوستان کے شہر بمبئی کا ایک دورہ ڈاکٹر محسن شمسی اور خاکسار، دونوں کا ،ایک وفد کی شکل میں ہوا، رابطہ کا تعارف کرانے اور اس کی ضرورت کا احساس دلانے کے لئے وہاں کے معززین حضرات کا ایک مشورہ حاجی علاء الدین مرحوم کی قیادت میں رکھا گیا، اس میں حاضرین سے گفتگو کی گئی، سب نے پسند کیا اور اس کام کو وقت کی ایک ضرورت سمجھ کر اس کی بھرپور تائید کی اور کسی قدر تعاون بھی حاصل ہوا۔

اس سفر میں ڈاکٹر شمسی کے ساتھ تقریباً ایک ہفتہ تک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اور اچھا وقت گذرا، باہر کے لوگوں نے اچھے خیالات کا اظہار کیا اور تعاون کا وعدہ بھی کیا، مگر افسوس کہ اس دعوتی عمل کو غیروں نے شک کی نظر سے دیکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سی آئی

ڈی کے حضرات اس کی حقیقت اور مقصد معلوم کرنے کے لئے اچانک آئے اور بتایا کی گورنمنٹ کی نظر میں یہ ایک مشکوک رابطہ تصور کیا جارہا ہے اور س کی سرگرمیوں کو غیر ملکی ناپسندیدہ عناصر کے ساتھ تعاون کرنے کا عندیہ ظاہر کیا جارہا ہے اور اس کو ملک کے مفاد میں نہیں سمجھا جارہا ہے، اس لئے اس وقت اس پر آپ لوگ روک لگا دیں، اس طرح برابر سرکاری انداز کی نگرانی جاری رہی اور وقتی طور پر اس کو مزید وسعت دینے سے روکنا پڑا، اس خیال سے کہ کہیں یہ کسی ناگواری کا سبب نہ بن جائے۔

ڈاکٹر شمسی صاحب نے ان حالات میں کام کرنے کو مناسب نہیں سمجھا اورانہوں نے خاموش دعوتی خدمت کو ہی بہتر تصور کیا، اس تعارفی ملاقاتوں کے بعد جناب کرنل شمسی صاحب اپنا کورس مکمل کر کے فوج کے زمرہ میں داخل ہو گئے اور عرصہ تک فوجیوں کی خدمت کرتے رہے۔ اور کرنل کے خطاب سے نوازے گئے۔ اور مختلف شہروں کی فوجی یونٹوں میں اس منصب کی بنا پر دیگر ڈاکٹروں کے ساتھ فوجی کیمپوں کے ہسپتال میں معالج رہے، اور اپنے امتیاز کو ہمیشہ قائم رکھا، ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہمہ تن دعوت و تعلیم کے میدان میں مشغول عمل ہو گئے، اور ندوہ کے ماحول سے پہلے سے مانوس تھے، بعد میں اور زیادہ تعلق قائم ہو گیا، مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے باقاعدہ بیعت وارشاد کا تعلق قائم کیا اور ندوہ کے کاموں میں خاصی دلچسپی لیتے رہے کچھ دنوں تک انگریزی کے گھنٹے بھی ڈاکٹر صاحب نے دارالعلوم کے درجات میں لئے اور ہر اعتبار سے یہاں کے علماء بالخصوص حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب نیز اس خاکسار سے بہت مخلصانہ تعلق قائم رکھا، اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ایک دوسری شادی، حالات کے بنا پر ہم لوگوں کے مشورہ کے مطابق کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور الحمد للہ مہمان خانہ دارالعلوم میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے عقد نکاح پڑھایا اور تا حیات ان کے ساتھ رہ کر اچھے انداز سے وقت گزارا،، سابقہ اہلیہ

سے بیٹے اور بیٹیوں کی بہتر سے بہتر خاندان میں شادیاں ہوئیں اور وہ سب ایک صالح اولاد کی طرح اپنی ملازمتوں میں مصروف ہیں، ندوہ سے نہایت درجہ مخلصانہ تعلق کی بنا پر مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کے رکن بھی منتخب ہوئے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شرکت کی، اس کے علاوہ وہ بہت سے خیر ودعوت اور تعلیم وتربیت کے کاموں میں حصہ لیتے رہے اور عوامی مفت علاج کرنے میں اپنا ثانی نہیں چھوڑا، اور مخلص دوستوں اور عقیدت رکھنے والوں کی ایک جماعت چھوڑ کر ۹/ دسمبر ۲۰۱۶ء کی شب میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجارت بلند فرمائیں اور ان کی لغزشوں کو معاف فرما کر ان کو اپنے انعامات سے نوازیں اور جنت الفردوس عطا فرمائیں، اور پس ماندگان نیز احباب ومخلصین کو صبر جمیل کے ساتھ ایصال ثواب کرنے اور دعائے مغفرت کی توفیق بخشیں (آمین)

مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانیؒ

متنوع خصوصیات کی حامل شخصیت

مشہور عالم دین حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مؤرخہ ۷؍ربیع الآخر ۱۴۴۱ھ مطابق ۵؍دسمبر ۲۰۱۹ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے، إنا لله وإنا إليه راجعون.

مفتی صاحب نے علم وتعلیم اور دعوت واصلاح سے معمور زندگی گذاری، فقہ وفتاوی تو ان کے روز وشب کا مشغلہ تھا، وہ صوبہ پنجاب کے مفتی اعظم رہے، اور فتوی کے ذریعہ عوام وخواص کو فیض پہونچاتے رہے، اور اپنے بیانات اور خطابات کے ذریعہ مزید اس کو وسیع کیا، اس طرح انہوں نے ایک قابل رشک زندگی گذاری، جو لائق تقلید ہے۔ خدا مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

مفتی عثمانی کی شخصیت میں متنوع خوبیاں جمع تھیں: ایک طرف وہ علمی شخصیت کے مالک تھے، تعلیمی زندگی کا آغاز تدریس سے کیا، دارالعلوم دیوبند میں وہ پہلے فارسی کے استاذ رہے پھر عربی درجات میں منتقل ہوئے، اور بحسن وخوبی اپنے فرائض ادا کرتے رہے، اسی درمیان وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء پر پنجاپ کے مفتی اعظم کے منصب پر فائز ہوئے، اور ۴۵؍سال تک اس منصب کو زینت بخشی اور اپنے بیانات اور خطابات سے بھی علمی و دینی بیداری کا کام کیا، اور ایک بڑی تعداد کو فیض پہونچایا، مفتی صاحب صرف مسلمانوں کے درمیان مقبول نہیں رہے، بلکہ ان کی اعتدال پسندی، معاملہ فہمی نے ان کو غیر مسلموں کا بھی محبوب بنا دیا تھا، ان کے فتاوی اتنے زیادہ ہیں، اگر ان کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہوں گی اور ان کا فیض آنے والی نسلوں تک

منتقل ہوگا، وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں دارالعلوم وقف دیوبند کے صدر مفتی بھی مقرر ہوئے اوراپنے وجود سے اس شعبہ کو مستفید کیا۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی اجتماعیت پسند تھے، انہوں نے گوشہ گیری کو ترجیح نہیں دی، اورعوام سے منقطع نہیں رہے، بلکہ ان کے درمیان رہ کران کے مسائل کوحل کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس ملنے آنے والی کی آمد ورفت رہتی تھی، وہ ملکی سطح پر قائم ہونے والی تحریکات کے بھی مؤید تھے، ان کو بڑے بڑے جلسوں، اجتماعات میں مدعو کیا جاتا تھا، وہ ان میں اپنی رائے ظاہر کرتے تھے، وہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اورآل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے وابستہ رہے، اورملی کونسل دہلی، فقہ اسلامی اکیڈمی دہلی کے رکن بھی مقرر کئے گئے، مجھے یاد ہے کہ وہ دارالعلوم وقف کی مجلس مشاورت کے سالانہ جلسوں کی صدارت فرماتے تھے، اوراپنے جامع خطاب سے مجلس کے ارکان کونوازتے تھے، ان کے بعض رسائل جیسے اسلامی قانون وراثت کوآل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آفس نے شائع کیا، جو معاشرہ میں پائی جانے والی بے راہ روی کی خلاف تھے۔

عثمانی خاندان اعلی نسبتوں کا حامل خاندان ہے، ماضی قریب میں اس میں کئی ممتاز علماءاوراصحاب فقہ پیدا ہوئے، مفتی صاحب کے اجداد میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے قیام میں شریک رہے، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دارالعلوم کے تقریبا پچاس سال تک مفتی رہے، ان کے فتاوی کا مجموعہ اہل علم کی آنکھوں کا سرمہ بن رہا ہے، تفسیر عثمانی جس کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمایا ہے، وہ بھی اسی عظیم خاندان کا کارنامہ ہے، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ندوۃ المصنفین جوایک علمی اور تحقیقی ادارہ تھا، اس کے روح رواں تھے، دنیائے ادب اردو میں مشہور ناقد اورادیب عامر عثمانی کا نام نامی جلی حروف میں رقم ہے، حضرت مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی خاندانی خوبیوں سے نہ صرف

متصف تھے، بلکہ ان کے ترجمان اور نمائندہ تھے، انہوں نے علمی دنیا کو دو عظیم تحفے دئے جو صدیوں تک یاد کئے جائیں گے، سات جلدوں میں ''نور القرآن'' کے نام سے بے مثال تفسیر ہے، جو قرآنی علوم ومعارف کی جامع ہے، اور دوسرے صحیح مسلم کی اردو شرح جو ''تفہیم المسلم'' کے نام سے ہے، وہ اہل علما ور طلبائے مدارس کے مطالعہ میں ہے، اور ان دونوں چشموں سے استفادہ جاری ہے۔ ان کتابوں کی ورق گردانی ہی سے مفتی صاحب کی عرق ریزی، محنت کوشی، غیر معمولی جہد مسلسل کا اندازہ ہوتا ہے۔

مفتی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر و بیانات، اور کتابوں کی تصنیف کے ساتھ اردو صحافت سے تعلق رکھا، صحافت میں ان کے نقوش بڑے گہرے اور دیرپا ہیں، بامقصد صحافت کے ذریعہ وہ اپنی بات پڑھے لکھے طبقے تک پہونچاتے تھے، اوراس کے لئے وہی اسلوب اختیار کرتے جو قارئین کے مزاج اور نفسیات کے مطابق ہوتا تھا، عصر جدید کے اسلوب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی دو خصوصیتیں ہیں: ایک آسان زبان میں لکھنا اور دوسرے مختصر لکھنا، مفتی صاحب نے اس اسلوب کو اپنایا، اور مالیر کوٹلہ سے ایک ماہنامہ اسی اسلوب کے مطابق جاری کیا، جو ماہنامہ ''دار السلام'' سے شائع ہوا، وہ رسالہ ماشاء اللہ ہمارے دفتر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء میں آتا تھا، جس سے ہم مفتی صاحب کے خیالات، آراء اور افکار سے واقف ہوتے، مفتی صاحب نے اپنے صاحبزادہ مولانا طارق عمیر عثمانی زید مجدہم کی اسی نہج پر تربیت فرمائی، وہ ماشاء اللہ اپنے والد کی امانتوں کے امین اور ان کے بہترین ترجمان ہیں، اور ''الولد سر لأبیہ'' کے مصداق ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے درجات بلند فرمائے، اور ان کی لغزشوں کو دور فرمائے۔ اللّٰهم إغفره وارحمه، وأجزه جزاء حسناً عن جميع المسلمين.

مولانا ڈاکٹر محمد لقمان سلفیؒ:
ایک علمی اور عملی شخصیت

علمائے ہند میں دعوت وتعلیم ،تصنیف وتحقیق اور اصلاح وتربیت کے میدان میں انمٹ نقوش قائم کرنے والی شخصیتوں میں ایک نمایاں شخصیت مولانا ڈاکٹر محمد لقمان سلفی رحمہ اللہ ہیں ،وہ علمائے اہل حدیث میں امتیازی شان کے مالک تھے ،ان کی وفات کا افسوس ناک واقعہ ۹/رجب ۱۴۴۱ھ مطابق ۵/مارچ ۲۰۲۰ء میں پیش آیا۔ فإنا لله وإنا إليه راجعون.

شیخ ڈاکٹر لقمان سلفی صوبہ بہار کے ضلع مشرقی چمپارن کے رہنے والے تھے،انہوں نے چندن باڑا نامی علاقہ میں جامعۃ الامام ابن تیمیۃ قائم کیا، جو دینی تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ ہے، جہاں ہزاروں طلباء علوم شرعیہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ،اور اپنے مستقبل کو روشن اور تابناک بناتے ہیں، مجھے ان کی مخلصانہ دعوت پر دسمبر ۲۰۰۵ء جامعہ ابن تیمیہ جانے کا موقع ملا،ان کے علمی اور عملی کارناموں کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ،انہوں نے اپنے شیخ علامہ ابن باز کی دعاؤں سے علم وعمل کے میدان میں بہت اچھی اور مثبت مثال قائم کی تھی ،اور مستند اور معیاری کتابوں کو تصنیف کرنے کی عزت حاصل ہوئی ،اس کے علاوہ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ماہنامے جاری کیے ،جن میں سے ایک طوبی اور دوسرا الفرقان کے نام سے متعارف ہے، وہ پابندی سے البعث الاسلامی ندوۃ العلماء کے آفس میں آتا ہے، جس سے مولانا ڈاکٹر محمد لقمان سلفی کے افکار وخیالات سے واقفیت ہوتی ہے،ان کی دعوت پر حاضری کے موقع پر میں نے دیکھا کہ انہوں نے دین کا ایک بڑا قلعہ تعمیر کردیا ہے، جامعہ کا قیام

۱۹۶۴ء میں عمل میں آیا، اس کے مؤسس اور مشرف ڈاکٹر لقمان سلفی صاحب تاحیات اس کے سارے نظام کی سرپرستی کرتے رہے، ان کے بنیادی مقاصد میں:

۱۔ اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنا اور زندگی گذارنے کا صحیح طریقہ سکھانا۔

۲۔ ملت کے نونہالوں کو فکری بے راہ روی اور الحاد و اباحیت پسندی سے موڑ کر صحیح اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرنا۔

۳۔ اچھی صلاحیت کے ساتھ ساتھ صالحیت سے مالا مال کر کے نونہالان قوم کو صحیح رہنمائی کرنے کے لائق بنانا۔

۴۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے بھی طلبہ کو مزین کرنا، تاکہ وہ ہر سطح پر دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکیں۔

جامعہ کے تعلیمی مراحل ابتدائیہ، متوسطہ، ثانویہ، عالمیت، فضیلت، المعہد العالی للتخصص فی التدریس والتربیۃ پر مشتمل ہیں، ڈاکٹر لقمان سلفی صاحب کی علم پروری کا ایک مظہر کلیۃ خدیجۃ الکبری لتعلیم البنات ہے، جس کو انہوں نے مسلم لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ۱۹۹۵ء میں قائم کیا، اسی کے ساتھ حفظ قرآن کے لئے معہد زید بن ثابت لتحفیظ القرآن ۱۹۸۹ء میں قائم کیا، اسی کے ساتھ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری، مرکز دعوت وارشاد، دارالافتاء، علامہ ابن باز ریسرچ سینٹر، دارالایتام والیتیمات، جامعہ ویلفیئر ہاسپٹل، امام ابن تیمیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، کمپیوٹر سینٹر وغیرہ شعبہ جات ہیں، جو جامعہ کے احاطہ میں سرگرم عمل ہیں۔

حضرۃ العلامۃ شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کے زمانہ مبارکہ میں مولانا ڈاکٹر محمد لقمان سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ان کے مرکز عمل علامہ عبدالعزیز بن باز کے آفس میں ہوئی، اس کے بعد برابر ان سے ملاقات ہوتی رہی، ان کی علمی اور تحقیقی اور تربیتی سرگرمیاں قابل رشک ہیں، اللہ تعالی نے ان سے بڑا علمی اور تعلیمی کام لیا، ان کی دعوت پر

۲۰۰۵ء میں جامعہ ابن تیمیہ کے احاطہ میں جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور قریب سے ساری سرگرمیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے جامعہ ابن تیمیہ کی زیارت ومشاہدہ کے بعد البعث الاسلامی میں فروری ۲۰۰۶ء میں اپنے کچھ تأثرات قلم بند کئے تھے وہ یہاں نقل کئے جارہے ہیں:

''علامہ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی بانی وسرپرست جامعہ ابن تیمیہ ومرکز العلامۃ ابن باز برائے اسلامی مطالعات کی مخلصانہ دعوت پر جامعہ کے احاطہ میں منعقد ایک علمی سیمینار میں شرکت کے لئے میں صوبہ بہار کے ضلع مشرقی چمپارن کے موضع چندن باڑا گیا، سمینار کا مرکزی موضوع تھا: مدارس اسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیاں: دعوت فکر وعمل۔ سیمینار کا آغاز خطبہ جمعہ سے ہوا، میں نے جامعہ کے ذمہ داران کے اصرار پر جامعہ کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ دیا، اور نماز پڑھائی، اس وقت مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران اور دانشوران موجود تھے، اس موقع پر ایک علمی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، جس میں جامعہ کی مطبوعات خاص طور پر پیش کی گئی تھیں، سمینار کی پہلی نشست کا موضوع مدارس اسلامیہ میں مسلم طالبات کا نصاب: تقاضے اور امکانات تھا، یہ نشست میری صدارت میں منعقد ہوئی، مہمان خصوصی پروفیسر کفیل احمد قاسمی (علی گڑھ) تھے، جلسہ کی نظامت مولانا فضل الرحمٰن ندوی نے کی، پروفیسر سعود عالم قاسمی نے قیمتی محاضرہ دیا، اخیر میں مجھے بھی کچھ عرض کرنے کا موقع ملا، اس کے بعد علماء صادقپور کی اہم شخصیت مولانا عبدالسمیع جعفری ندوی کے بدست ایک عمارت کا افتتاح ہوا۔ سمینار کی دیگر نشستیں بھی منعقد ہوئیں، جن میں ہندوستان کے مشہور اداروں اور جمعیتوں کے نمائندوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان میں مولانا اصغر علی امام مہدی، پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، مولانا ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی، پروفیسر غلام یحیی انجم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر علامہ محمد لقمان سلفی ایوارڈ برائے تعلیم بھی تقسیم کیا گیا، ایوارڈ کا

تعارف شیخ سمیع اللہ عمری نے کرایا، خطبہ استقبالیہ ڈاکٹر ارشد مدنی اور مرکز ابن باز کا تعارف ڈاکٹر عبد اللہ محمد لقمان سلفی نے پیش کیا، ماشاء اللہ یہ پروگرام ہر لحاظ سے کامیاب رہا اور سامعین نے پوری دلچسپی سے اس کو سنا اور اس کے اثرات لئے۔"

بلاشبہ مولانا ڈاکٹر لقمان سلفی نے ایک قابل رشک زندگی گذاری، علمی، تحقیقی، تعلیمی، تربیتی کئی میدانوں میں ان کے دیرپا نقوش محسوس کئے جائیں گے۔ اللہ تعالی ان کو غریق رحمت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے مشن کو آگے بڑھانے والے حضرات کو مزید ہمت وحوصلہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

بھٹکل کے مشہور ندوی فاضل

مولانا محمد اقبال ملا ندویؒ

جنوبی ہند کے صوبہ کرناٹک میں میں بھٹکل کے نام سے ایک شہر آباد ہے، جو اپنی ثقافت اور تہذیب میں ایک شناخت رکھتا ہے، وہاں اہل نوائط کی آبادی ہے، جن کا تعلق قدیم زمانے میں عربوں سے رہا، وہیں سے آکر اس خطہ میں انہوں نے بود و باش اختیار کی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے خاندانوں میں برکت عطا فرمائی، اس طرح بھٹکل کے نام سے اس شہر کو پورے ملک میں تعارف حاصل ہوا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھٹکل کے کئی اسفار ہوئے، وہاں کی علمی اور دینی مجالس میں انہوں نے خطاب بھی کیا، ان کے خطابات کا مجموعہ بھی شائع ہوگیا ہے، اسی طرح دیگر اہل علم نے بھی وہاں کا سفر کیا، مجھے بھی پہلی بار ۱۹۸۲ء میں جناب الحاج محیی الدین منیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر وہاں جانے کا موقع ملا، میں نے دیکھا کہ وہاں ماشاء اللہ علم وعلماء کی بڑی قدردانی ہے، اور مہمانوں کی خدمت واکرام میں وہاں کے رہنے والے ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھٹکل کو بیت الکل (سب کا گھر) کہتے تھے۔

بھٹکل کے افراد کا ندوۃ العلماء سے بڑا گہرا ربط رہا، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے معاصرین میں ایک ندوی فاضل ہیں، جو جنوبی ہند کے رہنے والے تھے، اور انہوں نے عرب و ہند کے تعلقات پر ایک کتاب میں تصنیف کی ہے، اس کے بعد متعدد افراد دارالعلوم ندوۃ العلماء حصول تعلیم کے لئے آئے، جب جامعہ اسلامیہ قائم ہوا تو پھر طلباء کی بڑی تعداد دارالعلوم حصول تعلیم کے لئے آنے لگی، اور ماشاء اللہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں بھٹکل کے رہنے والے مولانا محمد اقبال ملا ندوی دار العلوم تعلیم کے لئے آئے ، اور یہاں انہوں نے ایک با مقصد طالب علم کی حیثیت سے اپنا وقت گذارا، یہاں سے جانے کے بعد انہوں نے بھٹکل ہی کو اپنی خدمت کا مرکز بنایا، چنانچہ وہ جامعہ اسلامیہ کے صدر قرار پائے۔ جماعت المسلمین کے قاضی اور دیگر مناصب پر فائز رہے، فقہ وفتاوی سے انہیں خاصی دلچسپی تھی ،اور فقہ شافعی کی کتابوں کا وہ خاص طور سے مطالعہ کرتے تھے، تاکہ سوال کرنے والوں کی بروقت رہنمائی کرسکیں، علم افلاک کے بھی ماہر تھے، وہ سورج کے طلوع وغروب سے بڑی واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے ایک کلینڈر بھی ترتیب دیا، جس سے نمازوں کے اوقات کی صحیح تعیین ہوتی ہے، اوران کا بنایا ہوا کلینڈر اُس خطہ میں رائج ہے۔

مولانا اقبال ملا ندوی صاحب نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے پوری زندگی ربط رکھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء دامت برکاتہم کو اپنا سرپرست تسلیم کیا، اوران سے گہرا تعلق قائم کیا، اصلاح و تربیت کے میدان میں بھی ان سے مشورے کیا کرتے تھے، اور حضرت بھی ان پر اعتماد کرتے تھے، اوران کی قدر فرماتے تھے، یہاں تک کہ ان کو اصلاح وارشاد میں اجازت وخلافت بھی عطا فرمائی ، مولانا اقبال ملا ندوی نے اس نسبت کا لحاظ رکھا اور پوری زندگی اس کے شرائط پر عمل پیرا رہے، سنت کا احیاء، بدعت کا ازالہ اور جہالت وناخواندگی کو دور کرنا ان کا بنیادی مشن تھا۔

ملا محمد اقبال ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی زندگی گذاری، تعلیم وتربیت، اصلاح و ارشاد اور باہمی نزاعات کا تصفیہ یہ ان کی زندگی کے نمایاں عنوانات ہیں، کرونا کے زمانہ میں جس میں علماء کی معتد بہ تعداد دنیا سے رخصت ہوئے ، مولانا اقبال ملا بھی ۲۲/ ذی القعدہ ۱۴۴۲ھ مطابق ۱۵/ جولائی ۲۰۲۰ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، ان کے ساتھ عفو ومغفرت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائیں اوران کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگذر فرمائیں۔

مولانا مفتی عبداللہ مظاہریؒ

اور تعلیم وتربیت کے میدان میں ان کے نقوش

اہل علم کے حلقوں میں حضرت مولانا مفتی عبداللہ مظاہریؒ کی وفات کی خبر بڑی حسرت وافسوس کے ساتھ سنی گئی، انہوں نے ۱۸؍محرم ۱۴۴۲ھ مطابق ۷؍ستمبر ۲۰۲۰ء کواذان فجر کے وقت طویل علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم رویدرہ، ضلع بھروچ، گجرات کے رہنے والے تھے، ان کی پیدائش ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۱ھ میں ہوئی، گجرات قدیم زمانہ سے علما ومشائخ کا مرکز رہا ہے، وہاں کی سرزمین میں علم وعمل کی جامع شخصیات مدفون ہیں مثلاً حضرت ربیع بن صبیحؒ اور حضرت شیخ مخدوم علی مہائمی، شیخ عبداللطیف سراج الدینؒ، علامہ قطب الدین نہروالی، علامہ محمد بن طاہر پٹنی، حضرت شاہ وجیہ الدین، اور ماضی قریب میں حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری، مولانا عبدالعزیز میمنی قابل ذکر ہیں، اس وقت وہاں مدارس اسلامیہ بڑی تعداد میں قائم ہیں، اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً ہر جگہ فضیلت تک کی تعلیم کا نظم ہے، جہاں طلباء دورۂ حدیث مکمل کر کے مشہور اداروں کا رخ کرتے ہیں، اور وہاں سے مزید علمی استفادہ کرتے ہیں۔

مولانا مرحوم عالم باعمل تھے، انہوں نے علم وعمل سے معمور زندگی گذاری، وہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ تھے، وہاں کے علماء اور مشائخ سے انہوں نے تعلیم حاصل کی، خاص طور سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اسعداللہ صاحب رامپوریؒ کی تربیت سے مستفید ہوئے تھے، اور ان سے فیض اٹھایا تھا، اسی وجہ سے وہ اپنے نام سے ساتھ مظاہری لکھا کرتے تھے، اور رویدری کی نسبت ان کی وطنی نسبت ہے۔

مولانا نے علوم دینیہ کے نصاب سے فراغت کے بعد علم دین کی نشر واشاعت کو اپنا شعار بنالیا، اس کے لئے تدریس کو موضوع بنایا، مدرسہ سے وابستہ ہوئے، جامعہ فلاح دارین ترکیسر میں انہوں نے آٹھ سال تک تدریسی عمل جاری رکھا، پھر اللہ تعالی نے انہیں ہانسوٹ کے علاقہ میں ایک تعلیمی مرکز قائم کرنے کی توفیق بخشی، بحمد اللہ وہ مرکز جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ کے نام سے قائم ہوا، مولانا اس کے بانی تھے، انہوں نے شروع ہی سے اس میں اپنے ذہن و دماغ کو صرف کیا، اور ایک مثالی ادارہ بنایا، اس سے سیکڑوں طلباء فارغ ہوکر دین کی تبلیغ ودعوت میں مصروف ہیں۔

مولانا مرحوم مجھ سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، وہ کبھی کبھی ندوہ آتے اور ملاقات کا موقع دیتے، مجھے بھی انہوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ کی زیارت کی دعوت دی اور ان کی دعوت پر وہاں جانا ہوا، وہاں کا تعلیمی اور تربیتی نظام دیکھ کر مسرت ہوئی، وہ علوم دینیہ کا اسلامی قلعہ تعمیر کرکے دنیا سے رخصت ہوئے، یہی قلعہ ان کی ترقی درجات اور مغفرت کا بہترین سامان ہے، صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی ساری دنیاوی سرگرمیاں منقطع ہوجاتی ہیں سوائے صدقہ جاریہ، اور نفع بخش علم اور نیک اولاد کے، کیونکہ ان کا فیض مرنے کے بعد بھی انسان کو قبر میں پہونچتا رہتا ہے۔

مولانا مرحوم کی زندگی میں بزرگوں اور علماء سے تعلق کا اثر بڑا گہرا تھا، اور ان کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کی پابندی کرتے تھے، ادھر کئی سالوں سے ہر سال حج کی سعادت حاصل کرتے تھے، اس میں ان کے کئی رفقاء ہوتے تھے، وہ اس کے اجر میں مجھ کو بھی شریک کرتے کہ میں سعودی سفارت خانہ کو ان کے لئے اور ان کے رفقاء کے لئے ہر سال ایک سفارشی خط لکھ دیا کرتا تھا اور بحمد اللہ ان کو وہاں سے ویزہ حاصل ہوجاتا اور حج کا سفر بسہولت ممکن ہوتا تھا۔

اللہ تعالی مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائیں۔ آمین، وصلى الله تعالى على خير خلقه محمد وعلى آله و صحبه أجمعين.

مولانا فضل ربی ندویؒ:
میدان دعوت وفکر کی ایک اہم شخصیت

مولانا فضل ربی ندوی ایک عالم دین اور دعوت وفکر اسلامی کے میدان میں نمایاں فرد تھے، انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، دارلعلوم میں ابتدائی درجات میں داخل ہوئے اور عالمیت کی سند لے کر دعوت فکر وعمل میں مشغول ہو گئے، دار العلوم میں ان کا قیام بیسویں صدی عیسوی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں رہا، وہ ایک محنتی طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم میں رہے، درجہ اور درجہ کے باہر میرا بھی ان سے بڑا تعلق خاطر رہا، وہ ایک ہونہار اور سعادت مند طالب علم کی طرح اپنی سرگرمیاں انجام دیتے رہے ،فراغت کے بعد اگر چہ دار العلوم سے ان کا کوئی قانونی تعلق نہیں رہا، لیکن دارالعلوم اور اس کے اساتذہ، اور خاص طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) سے ان کو بڑا گہرا تعلق رہا، اور حضرت مولانا بھی اس تعلق کی قدر فرماتے اور محبتوں سے نوازتے تھے۔

مولانا فضل ربی ندوی کا آبائی وطن کلکتہ تھا، ان کے والد الحاج محمد عارفین تھے، جو ایک تجارتی کاموں میں مشغول رہتے تھے، کلکتہ میں ان کا بڑا کاروبار تھا، لیکن تجارت کے ساتھ دینداری ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، انہوں نے اپنے صاحبزادے مولانا فضل ربی ندوی کو پندرہ سال کی عمر میں دار العلوم ندوۃ العلماء تعلیم کے لئے بھیجا، اور انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ علم حاصل کیا، الحاج محمد عارفین علماء نواز تھے، ان کی خدمت کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے

رہے، اوران کے فیوض و برکات سے سے بھی مستفید ہوتے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ۱۹۶۰ء میں جب برما کا سفر کیا تو راستہ میں کلکتہ کی ضیافت انہیں کے حصہ میں آئی، جس کو وہ ایک ''نعمت کبری'' سے تعبیر کرتے تھے۔

ایسے صالح فرد کی صالح اولاد تھے مولانا فضل ربی ندوی، (اللہ تعالی ان پر رحمتوں کی بارش کرے، اوران کے ساتھ اپنے عفو وکرم اور رحمت ومغفرت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائے)، اسی صالح تربیت کا اثر تھا کہ مولانا فضل ربی ندوی کا مزاج دعوتی اور اصلاحی رہا، وہ سات سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرکے پاکستان منتقل ہوگئے، لیکن ان کی یہ منتقلی دعوتی اور فکری لحاظ سے مفید ثابت ہوئی، انہوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مشورہ سے ایک نشریاتی ادارہ (مجلس نشریات اسلام کراچی) ۱۹۷۲ء میں قائم کیا، اوراس کے ذریعہ ندوۃ العلماء اوراس کے فکر کی کتابوں کو خوب خوب اشاعت کی، جس کا اثر یہ ہوا کہ پورے پاکستان واطراف میں ندوی فضلاء کی کتابیں بڑے پیمانہ پر عام ہوئی، اوران کی فکر وہاں تک پہونچی۔ وہ برابر خطوط کے ذریعہ اور یہاں سے جانے والے اشخاص کے ذریعہ حالات معلوم کرتے رہتے تھے، اور تعلق رکھتے تھے، ان کے ان تعلقات کا ایک رمز تو مجلس نشریات اسلام کراچی ہے، جہاں سے سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں، دوسرا رمز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور علمائے ندوۃ العلماء کے وہ خطوط ہیں، جو انہوں نے محفوظ رکھے، خاص طور سے انہوں نے اپنی وفات سے کئی سال پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے خطوط کتابی شکل میں شائع کیے، جن سے حضرت مولانا سے ان کے تعلق اور باہمی اعتماد کا علم ہوتا ہے، انہی خطوط کو مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (جلد پنجم) میں شائع کیا گیا ہے، اس کے سطر سطر سے ندوۃ العلماء اوراس کی معتدل فکر سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا اندازہ ہوتا ہے، حضرت مولانا نے اپنے خطوط میں انہیں عزیز القدر۔۔۔۔۔۔سلمہ اللہ وبارک فیہ سے مخاطب کیا ہے، اور

بے پناہ دعاؤں سے نوازا ہے، ان خطوط کا دورانیہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۶ء تک ہے، اس درمیان طرفین میں مکاتبت جاری رہی، جو ایک تاریخی امانت کے طور پر محفوظ ہوگئی ہے۔

مجھے جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی، ذاتی طور پر بڑا صدمہ ہوا کہ ایک مخلص، محنتی عالم وداعی کی رحلت ہوئی، میں نے ندوۃ العلماء کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، اوران کے کارناموں کو قابل فخر قرار دیا ہے، قوی امید ہے کہ ان کے صاحبزادگان جن کے لئے حضرت مولانا نے اپنے مکتوبات میں جابجا دعائیں دی ہیں، ان کے مشن کو آگے بڑھائیں گے اور اچھی جانشیں ہونے کا کردار ادا کریں گے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ ان کے کاموں کو قبول فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں اوران کی لغزشوں کو معاف فرمائیں، اوران کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ:

یادوں کے نقوش

فعال شخصیت:

مولانا نذر الحفیظ ندویؒ کا سانحہ ارتحال علمی اور ادبی دنیا کے لئے ایک بڑا خسارہ ہے، وہ ایک سرگرم اور فعال شخصیت کے مالک تھے، اللہ تعالی نے ان کے اندر متنوع خوبیاں ودیعت کی تھی، ان کا مطالعہ تازہ رہتا تھا، حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے، مغربی میڈیا اور اس کی خرابیوں پر ان کا تجزیہ گہرے علم ومطالعہ کا نتیجہ تھا، انہوں نے اپنے آپ کو بزرگوں سے وابستہ رکھا، ابتدائی زندگی میں حضرت مولانا محمد احمد پرتا پگڑھیؒ کے دامن فیض سے وابستہ رہے، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوران ہی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے وابستہ ہوئے، اور آخر تک اس ربط وتعلق میں کوئی کمی نہیں آنے دی، یہی چیز انسان کی مقبولیت کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ نیک کاموں میں استقامت کا مظاہرہ کرے اور اپنے کسی عمل سے خلاف شرع کسی چیز کا اظہار نہ کرے۔

ناگہانی حادثہ:

۱۵/شوال ۱۴۴۳ھ کو مسجد دار العلوم ندوۃ العلماء میں نماز جمعہ کے لئے آئے، نماز اور سنتوں سے ابھی فارغ ہوئے کہ یہ غمناک اطلاع ملی کہ مولانا نذر الحفیظ ندوی کا ابھی ایک بجے کے قریب انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ غیر متوقع خبر، اور ناگہانی اطلاع سے بہت زیادہ حسرت وافسوس ہوا، اور زبان پر بے ساختہ یہ تأثر آیا کہ مولانا کی وفات

علمی وادبی دنیا کا ایک بڑا سانحہ ہے، اس کے بعد فوراً ندوہ اسٹاف کوارٹر کی طرف گیا، دیکھا تو وہاں متعلقین اور اساتذہ وکارکنان دارالعلوم کا ہجوم ہے، مولانا کے چھوٹے بیٹے اعظم شرقی ندوی اور دیگر اعزہ سے ملاقات ہوئی، اور تعزیت پیش کی، جب کہ پورا دارالعلوم تعزیت کا مستحق تھا کہ اس کے ایک اہم استاذ اور کلیۃ اللغۃ کے عمید دنیا سے رخصت ہوئے، مولانا کے مکان کے پاس موجود ہی تھے کہ ندوۃ العلماء کے بعض مخلصین کے فون آئے، وہ مولانا کے انتقال کو اپنے لئے بڑا خسارہ تصور کر رہے تھے، اسی وقت طے ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہوگی، اس کے بعد اپنے مکان پر واپس آ گیا، اس درمیان کئی مخلصین کے مزید فون آئے، مغرب کے بعد مولانا کے مکان پر جانا ہوا تو وہاں تعزیت کرنے والے بڑی تعداد میں موجود تھے، وہاں تعزیت میں تھوڑی دیر بیٹھ کر مسجد دارالعلوم آیا، نماز عشاء کے بعد مرحوم مولانا نذرالحفیظ ندوی کے جنازہ کی نماز اس عاجز کو پڑھانی پڑی، مرحوم مولانا نذرالحفیظ ندوی کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔ اور ڈالی گنج کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مولانا کے انتقال پر میرا تعزیتی تأثر:

وفات کے دوسرے دن میں نے ملک کے اردو اخبارات کو ایک تعزیتی بیان بھیجا، اس میں یہ تھا کہ ”مولانا نذرالحفیظ ندویؒ ندوۃ العلماء کے نمایاں فضلاء میں تھے، انہوں نے علم وادب، صحافت اور فکر اسلامی کے میدان میں گرانقدر خدمات انجام دی، وہ ادب اسلامی کے ہراول دستہ میں تھے، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے آغاز سے اس کے پروگراموں میں حصہ لیتے رہے، پھر ایک ذمہ دار کی حیثیت سے ان میں ان کی شرکت ہوتی رہی، بلکہ اس کے نظم ونسق میں ان کا بنیادی کردار ہوتا تھا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اساتذہ اور طلباء کے درمیان ایک موقر استاذ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، تدریسی زندگی میں ابتدائی درجات سے ترقی کرتے ہوئے علیا درجات، بلکہ المعھد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی، شعبہ صحافت

ولسانیات کے استاذ رہے، المعهد العالی للدعوة والفکر الاسلامی کے مدیر بھی رہے، اور کلیة اللغة العربیة وآدابها میں عمید (صدر شعبہ) کے درجہ پر فائز تھے۔

دار العلوم ندوة العلماء میں ۱۹۵۵ء میں وہ حصول تعلیم کے لئے آئے، اسی سال سے مجھ سے بھی ربط وتعلق رہا، اور درجات میں کئی سال ان کے درجے میں میرے تعلیمی گھنٹے رہے، پھر جب وہ مصر کے جامعہ ازہر گئے اور مجھے اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کو شیخ الأزہر عبد الحلیم محمود کی خصوصی دعوت پر وہاں جانا ہوا تو ان سے اور ان کے رفیق مولانا عبد النور ندوی سے اچھی ملاقاتیں رہی، ازہر سے واپسی کے بعد وہ دار العلوم میں استاذ مقرر ہوئے اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے علوم ومعارف سے خوب فیض یاب ہوتے رہے، اور حضرت مولانا کے بعد حضرت کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے رہی اخلاص ومحبت پر مبنی تعلق قائم رکھا۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی نے کچھ علمی آثار چھوڑے ہیں، جو ان کے لئے صدقہ جاریہ ہیں، اسی کے ساتھ جن طلباء نے ان سے اس مدت میں پڑھا ہے وہ ان کے لئے رفع درجات کا ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے ساتھ عفو ومغفرت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائے، اور ان کے پسماندگان، خاص طور سے دونوں صاحبزادے مولوی محمد معظم شرقی اور مولوی محمد اعظم شرقی ندوی، اور تینوں صاحبزادیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے‘‘۔

البعث الاسلامی میں مولانا نذر الحفیظ ندوی کے بارے میں:

کورونا کے زمانہ میں دار العلوم میں وفات کے متعدد واقعات پیش آئے، ان میں مولانا نذر الحفیظ ندوی کا سانحہ وفات طبیعت پر اثر انداز ہوا، میں نے ندوة العلماء کے عربی ترجمان ماہنامہ البعث الاسلامی کے ذی قعدہ ۱۴۴۲ھ کے شمارے کا افتتاحیہ (ماضی قریب

میں رخصت ہونے والی ندوۃ العلماء کی شخصیات اور خاص طور پر مولانا نذر الحفیظ ندوی پر) لکھا، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

> ''مولانا نذر الحفیظ ندوی نے ۱۹۵۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، اور آخری درجات تک پوری مستعدی اور نشاط کے ساتھ پڑھا، اور اپنے علمی وزن اور صلاحیت کی وجہ سے جامعہ ازہر بھیجے گئے، اور وہاں انہوں نے اچھا وقت گذارا، میں نے اپنے سفر نامہ مصر میں ان کی مرافقت، اور مصری اداروں اور اساتذہ سے متعارف ہونے میں ان کے تعاون کا تذکرہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے علمی حلقوں اور اداروں سے خوب واقف تھے، اور ان کے نظریات و افکار کا گہرا مطالعہ بھی تھا، شیخ الأزہر کے پاس ملاقات کے لئے جانا تھا تو ان سے اور مولانا عبد النور ندوی سے مدد ملی۔''

فکر ندوۃ العلماء کی اشاعت اور مولانا نذر الحفیظ ندوی:

مولانا نذر الحفیظ ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس کی تعلیمی سرگرمیوں کے دائرے کو وسیع کرنے میں حصہ لیتے تھے، اور نوجوان فضلاء کو ندوۃ العلماء اور اس کی فکر سے قریب کرنے میں ان کو غیر معمولی دلچسپی تھی، ماضی قریب میں نوجوان فضلائے ندوۃ العلماء کے اجتماعات کو انہوں نے آن لائن خطاب کیا، اور ان کی حوصلہ افزائی کی، خاص طور سے قطر کے ابناء ندوۃ العلماء ان سے متعلق رہے، اور مولانا کا بھی قطر کا سفر ہوتا تھا، اور وہاں جا کر ان کی سرپرستی کرتے تھے، قطر ہی میں مقیم ایک ندوی فاضل مولوی حبیب الرحمٰن ندوی نے ان کی کتاب (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات) کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اور وہ عالم عربی کے مکتبات سے شائع ہو چکا ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کی سالانہ نشستوں اور مذاکرہ علمی میں ان کی شرکت ایک فعال کارکن کی حیثیت سے ہوتی، وہ پروگرام سے دو دن پہلے جائے پروگرام پر اپنی ٹیم کے

ساتھ پہونچ جاتے اور پورا نظام سنبھالتے۔ ملک سے باہر رابطہ کے پروگراموں میں بھی ان کی شرکت رہی، ترکی، مصر اور حجاز کے رابطہ کے جلسوں میں شریک رہے، وہ ہندوستان کے رابطہ کے اردو ترجمان کاروان ادب کی مجلس ادارت میں تھے اور اس رسالہ میں مضمون بھی لکھتے تھے۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی کی ندوۃ العلماء سے وابستگی شروع ہی سے رہی، اور اس وابستگی میں استقامت کو لازم پکڑا، وہ کچھ سال تعلیم کے لئے جامعہ ازہر مصر گئے، واپسی میں پھر ندوۃ العلماء میں قیام کو ترجیح دی، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے علمی معاون قرار پائے، انہوں نے فکر ندوۃ العلماء کو پورے طور پر اپنے اندر جذب کر لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا نے کئی عالمی سیمناروں میں ان کو اپنی نمائندگی کے لئے بھیجا، اور انہوں نے اس کا حق ادا کیا، حضرت مولانا کے انتقال کے بعد تاریخ ندوۃ العلماء کی تیسری اور چوتھی جلدوں کی ترتیب کے سلسلہ میں مجلس انتظامی میں تجویز آئی تو ان کا نام منتخب کیا گیا، انہوں نے اس کام کا آغاز بھی کر دیا تھا، اور خطہ وغیرہ بھی تیار کر لیا تھا، مزید مواد بھی جمع کر لیا تھا، اب ترتیب و تدوین کا کام باقی تھا کہ ان کے لئے اللہ تعالی کا فیصلہ اس دار فانی سے کوچ کرنے کا آیا، اور انہوں نے عالم جاودانی کو کوچ کیا، غفر الله له و أدخله فسيح جناته.

حضرت مولانا سے تعلق کے کچھ مظاہر:

مولانا نذر الحفیظ ندوی نے وفات سے کچھ مہینے قبل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مجالس جو اُن کے پاس نوٹس کی شکل میں تھی مرتب کیا، وہ مجالس علم وعرفاں کے نام سے شائع ہو کر آئی تو مولانا نے بڑے اہتمام سے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا، اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ مولانا نے حضرت کی مجالس میں عقیدت و محبت کے ساتھ

استفادہ کے جذبہ سے شرکت کی اور یہ قیمتی موتی جو ان کے پاس موجود تھے عوام وخواص کو پیش کیا۔ یہ کتاب سید احمد شہید اکیڈمی، دار عرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی اور اس میں تقریباً ساٹھ مجالس کا تفصیلی ذکر آیا ہے، شروع میں انہوں نے ناشر کی گذارش پر حضرت مولانا سے اپنے تعلق کی روداد بھی سنائی ہے، جو طلباء کے لئے خاص طور پر استفادہ کی چیز ہے۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی کے حضرت مولانا سے تعلق کا ایک مظہر ان کے خطوط ہیں، جو انہوں نے حضرت کو ارسال کئے، پھر حضرت نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے، یہ خطوط مکتوبات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جلد پنجم میں ایک سو پانچ صفحات میں موجود ہیں، ان میں جا بجا حضرت مولانا سے محبت اور تعلق کے مظاہر ہیں، عموماً یہ خطوط اس زمانہ کے ہیں، جب مولانا نذر الحفیظ ندوی قاہرہ میں مقیم تھے، اور تعلیم حاصل کر رہے تھے، حضرت مولانا اور مصر کی علمی ودعوتی شخصیات کے درمیان بھی ہمزۂ وصل تھے، ان خطوط میں حضرت مولانا کی کتابوں کی مصر سے اشاعت اور ان کی فکر کی ترسیل کے سلسلہ میں اہم گوشے سامنے آئے ہیں۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی نے مصر کے زمانہ قیام میں حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کی کتابوں پر ڈاکٹریٹ کرنی چاہی، لیکن اس کی کوئی ترتیب وہاں نہیں بن سکی تو ایک رسالہ (ابوالحسن علی الندوی کاتبا ومفکرا) کے نام سے تیار کیا، جس کی بڑے پیمانہ پر اشاعت ہوئی، عالم عربی کے کئی مکتبوں نے اس کو شائع کیا، اور اس کو اہتمام سے پڑھا گیا۔

احسان شناسی اور اعتراف نعمت کی ایک مثال:

ابھی چند سال پہلے میرے اردو خطبات کا ایک مجموعہ (خطبات علم ودعوت) کے نام سے مرتب کی گیا، بعض احباب کا مشورہ ہوا کہ ان سے مقدمہ لکھوایا جائے، میں نے مسودہ بھیجا تو مولانا نذ الحفیظ ندوی نے پوری کتاب کو پڑھ کر تین صفحات پر مشتمل ایک

مقدمہ لکھا، اور قدر افزائی کے کلمات سے نوازا، نوجوان نسل کے استفادہ کے لئے مولانا کا لکھا ہوا یہ ایک اقتباس ذکر کیا جا رہا ہے:

''سولہ (۱۶) مرکزی عنوانات اور (۸۰) سے زائد ذیلی مضامین کے تحت مقرر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے کہ اس کے مخاطب علما اور طلباء تھے، صاحب کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ نوجوان نسل کے ذوق ومزاج، نفسیات اور تیزی سے بدلتے معاشرتی اور اخلاقی اور مادی قدروں کے نئ نسل پر گہرے اثرات سے خوب واقف ہیں، اس لئے کہ وہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے تعلیم وتربیت سے وابستہ ہیں، ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ خطبات جمعہ وعیدین کے ذریعہ عوام وخواص کی ذہنی سطح سے بھی نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں، بلکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ، یہاں تک کہ غیر مسلموں سے بھی ان کے روابط ہیں، استاذ محترم کی ان برجستہ تقریروں کو پڑھنے والے ہمارے اس تجزیہ سے اتفاق کریں گے کہ عوام وخواص اور تعلیم یافتہ طبقہ، خصوصا علماء اور طلباء کی رہنمائی کا اس مجموعہ میں خاصا مواد موجود ہے، تمام تقریریں ''کلموا الناس علی قدر عقولھم'' کا مصداق ہیں، خطبات علم ودعوت گویا علم کو دعوتی روح اور جذبہ سے سرشار ہوکر علم کو نافع بنانے کی دعوت ہے''۔ (ماخوذ مقدمہ کتاب خطبات علم ودعوت)

اسی طرح میری کتاب (ساعۃ مع العارفین) کی مصر سے طباعت میں ان کے گرانقدر مشورے رہے، اور ماشاء اللہ کتاب خوبصورت گٹ اپ سے شائع ہوئی، پھر یہ کتاب مکتبہ فردوس لکھنؤ سے شائع ہوئی، اور (تذکرہ اہل دل) کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا نذر الحفیظ ندویؒ کو اپنے عفو ومغفرت کے سایہ میں لے لے، اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اوران کی کوششوں کو قبل فرمائے۔

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ

مخلص عالم و منتظم

ندوۃ العلماء کے نائب ناظم مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی چند ماہ کی علالت کے بعد ۱۷؍سال کی عمر میں ۲۴؍رمضان ۱۴۴۲ھ مطابق ۷؍مئی ۲۰۲۱ء کو نماز عصر کے بعد احاطہ ندوۃ العلماء میں انتقال کر گئے ، انا للہ وانا الیہ راجعون ، مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کی رحلت صرف خانوادۂ علم اللہی ، خاص طور سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے لئے غم وفکر اور رنج والم کی باعث نہیں تھی ، بلکہ یہ ندوۃ العلماء کے ایک عالم ، اور اعلیٰ منتظم کی رحلت تھی ، جس کا اثر پوری ندوی برادری پر پڑا ، ان کی وفات سے ندوۃ العلماء اپنے ایک مخلص سپوت سے محروم ہوگیا ، مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے بھتیجہ اور داماد بھی تھے ، ان کی ولادت دسمبر ۱۹۵۰ء میں ہوئی ، اور ابتدا ہی سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے زیر تربیت رہے ، گھریلو تعلیم کے بعد ثانویہ کی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی ، اور عالمیت وفضیلت کی سند حاصل کی ، لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے بھی کیا ، اور اپنے والد گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے متنوع علمی کاموں میں تعاون کرنے لگے۔

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندویؒ کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا ، ان کے والد نے مکتبہ اسلام قائم کیا تھا ، جہاں سے علمی ، دینی کتابیں ہوتی تھی ، یہ نصابی اور غیر نصابی کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مکتبہ ہے ، اس کو جاری رکھنے میں مولانا حمزہ حسنی نے اپنے والد ماجد کا تعاون کیا ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرگذشت (کاروان

زندگی سات جلدیں) کو خوبصورت انداز میں شائع کیا، اسی طرح سیرت وسوانح پر متعدد کتابیں شائع کی، مناجات، اور ہاتف غیب، درود وسلام، ترانے اور نظمیں بھی شائع ہوئی، اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی، محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحب، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، مخدومہ خیر النساء بہتر (والد ووالدہ حضرت مولانا) کی کتابوں کے ساتھ دیگر مصنفین میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا عاشق الٰہی بلندشہری، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی وغیرہ کی کتابیں بھی شائع کی اور ہندی میں بھی بعض کتابیں شائع ہوئیں، اس طرح مکتبہ اسلام ایک معیاری مکتبہ ہوگیا، جس کی ایک پہچان ہے، اور علم دین، اصلاح وتربیت کے پیاسے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد ثانی حسنی نے خواتین کی اصلاح وتربیت کے لئے ۱۹۵۶ء میں ایک ماہنامہ رضوان جاری کیا تھا، اس ماہنامہ نے خاموشی کے ساتھ طبقہ نسواں میں اہم تعمیری خدمات انجام دی ہے، اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، مولانا سید محمد حمزہ حسنی جو اپنے والد کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے انہوں نے اس ماہنامہ کو جاری رکھنے اور اس کی اشاعت کے دائرہ کو عام کرنے میں حصہ لیا، اور رسالہ کو اور زیادہ مفید بنایا، وہ چالیس سال تک اس کے ایڈیٹر رہے، اس درمیان انہوں نے کئی خاص نمبر نکالے، جن میں امہات المؤمنین اور صحابیات نمبر قابل ذکر ہیں، (اپنی بہنوں سے) کے عنوان سے وہ اداریہ لکھتے، وہ اداریہ ایک صفحہ میں ہوتا، لیکن پوری بات اس میں آجاتی تھی، وہ اداریہ کبھی کبھی پندرہ روزہ تعمیر حیات میں نقل کیا جاتا، ایک موقع پر دارالعلوم کے ایک طالب علم محمد صادر نے اس کا عربی ترجمہ کیا تو ہم نے البعث الاسلامی میں شائع بھی کیا۔ میری اہلیہ (اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے) اس رسالہ رضوان کی خریدار تھیں، وہ پابندی سے اس کا زرتعاون جمع کرتی، اور رسالہ بھی گھر میں پورے اہتمام سے پہنچتا تھا۔ اور بچیوں اور خواتین کی اصلاح کا ذریعہ ہوتا

تھا، اب بھی یہ جاری ہے، اور فیض یابی کا ذریعہ ہے۔

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی نے ندوۃ العلماء میں ایک مخلص انسان کی زندگی گذاری، وہ اس کی مجلس انتظامی کے ۱۹۹۰ء میں رکن منتخب ہو گئے تھے، لیکن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید عبداللہ عباس ندوی کی تجویز پر ندوۃ العلماء کے ناظر عام منتخب ہوئے، پھر جب ندوۃ العلماء کے نائب ناظم مفتی محمد ظہور ندوی کا ۲۰۱۸ء میں انتقال ہوا تو میں نے انھیں نائب ناظم بنائے جانے کی تجویز رکھی، بحمد اللہ اس کو حضرات ارکان نظامت نے قبول کیا، اس طرح مولانا نے نائب ناظم کی حیثیت سے ندوۃ العلماء کی ذمہ داریاں سنبھالی، اور ندوۃ العلماء کے تمام امور میں پورے اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ مشغول رہے۔ اور ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کا تعاون کرتے رہے کہ ان کی وفات کا سانحہ پیش آیا۔

مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کا ایک اہم تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے مکتوبات کو پانچ جلدوں میں جمع کیا ہے، ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے، مزید جلدوں کو مرتب کر دیا تھا، لیکن ان کی اشاعت ابھی نہیں ہوسکی، انہوں نے اگرچہ حضرت مولانا کی زندگی میں جمع وترتیب کا کام شروع کر دیا تھا، لیکن وفات کے بعد سید احمد شہید اکیڈمی رائے بریلی سے اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوسکی، ادھر حالیہ برسوں میں اس کام میں تیزی آئی، اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے اس کی از سر نو پانچ جلدیں شائع کی تو مولانا نے اس کا ایک سیٹ مجھے بھی بھیجا، یہ بلاشبہ علوم و معارف کا خزانہ ہے، جس کے جمع کرنے کا عظیم کام مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی نے کیا ہے، مکتوبات میں مذکور تمام شخصیات کا جامع تعارف پیش کیا ہے، اور پیش آمدہ اہم واقعات کی تشریح وتوضیح کی ہے، مولانا نے مجھ سے بھی حضرت مولانا کے کچھ خطوط طلب کئے، میں نے ان کو دیئے تو ان کو بھی پورے اہتمام اور تعارفی نوٹ کے ساتھ

شائع کیا، میری خوش نصیبی رہی کہ مجھے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شفقتوں کے سائے میں ۴۸ سال گذارنے کا موقع ملا، اس درمیان متعدد خطوط حضرت مولانا نے مجھے لکھے، میں نے ان کو (مکاتیب مفکر اسلام) کے نام سے جمع کر دیا ہے، اور وہ مکتبہ فردوس سے شائع ہو گئے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلی اسے اعلی مقام عطا فرمائے۔

قاری مشتاق احمد پرتاب گڑھیؒ:
ایک تعلیمی شخصیت

نمونۂ سلف عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ ولی کامل، عابد وزاہد اور مقبول علماء وصلحاء میں تھے، اللہ تعالی نے ان کو محبوبیت وللّٰہیت کے عظیم مرتبہ پر فائز فرمایا تھا، ان کے ذریعہ اللہ تعالی نے ایک بڑی تعداد کو صلاح وکامیابی کے راستہ پر ڈالا، وہ صحیح معنوں میں نمونۂ سلف تھے، ملک کے علماء ومشائخ ان کے یہاں حاضری دیتے، اور کسب فیض کرتے، وہ بھی علماء اور اہل علم کی ایسی قدر کرتے کہ جو بھی ان سے ملتا، ان کی محبت اس کے اندر پیوست ہو جاتی۔

حضرت مولانا محمد احمد پرتا پگڑھیؒ کا ندوۃ العلماء اور خاص طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بڑا گہرا تعلق تھا، وہ ندوۃ العلماء تشریف لاتے تو اساتذہ وطلباء کو استفادہ کا موقع ملتا، اور اور ندوہ کے کئی روزہ قیام میں ان کی تربیتی واصلاحی مجالس منعقد ہوتی، راقم الحروف پر حضرت مولانا پرتاپ گڑھی کی خصوصی عنایت تھی، وہ بہت شفقت کا معاملہ کرتے تھے، اور میری ادنی درخواست پر میری قیام گاہ (جو ندوہ سے متصل مکارم نگر میں ہے) کو رونق بخشتے تھے، ان کی ہمت افزائی اور دعاؤں سے مجھے پہلی بار ان کے عارفانہ مجموعہ کلام (عرفان محبت) کو اپنے دوست مولانا سید محمد الحسنیؒ کے مشورہ سے مکتبہ فردوس سے شائع کرنے کا موقع ملا اور بحمد اللہ حضرت نے اسے پسند فرمایا اور دعاؤں سے نوازا۔

اسی نسبت اور تعلق کی بنا پر حضرت کے صاحبزادے حضرت قاری مشتاق احمد پرتابگڑھیؒ سے بھی تعلق رہا، ان سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں پھر یہ ملاقات گہرے تعلق

میں تبدیل ہوگئی اور حضرت قاری مشتاق احمد صاحب جب بھی ندوہ آتے تو ان سے ملاقاتیں ہوتیں اوران کی سرگرمیوں کا علم ہوتا رہتا۔

حضرت قاری مشتاق احمد پرتابگڑھی لکھنؤ میں مشہورادارہ مدرسہ فرقانیہ کے جید استاذ تھے، وہاں وہ حفظ وقرأت کی تعلیم دے ریتے رہے، اور پورے شہر پران کا اچھا اثر رہا، پھراللہ تعالی نے ان کوتوفیق دی کہ وہ ایک مستقل ادارہ قائم کریں، جس میں حفظ وقرأت کے ساتھ عربی درجات کی بھی تعلیم ہو، بحمداللہ یہ کوشش بارآور ہوئی، ابتدامیں توایک مسجد میں یہ ادارہ قائم ہوا، پھر اللہ نے ان کے لئے اسباب ووسائل فراہم کئے اور قلب شہر چوک میں اکبری گیٹ عبدالعزیز روڈ پران کوآراضی مل گئی اور وہ ادارہ قائم ہوگیا۔اور وہاں حفظ و قرات کا باقاعدہ آغاز ہوگیا۔ بلکہ وہ مدرسہ فرقانیہ کے بالکل متوازی، بلکہ اس سے بھی وسیع ادارہ ہوگیا، ملک کے اطراف واکناف سے طلباء وہاں آنے لگے، اور روایت حفص کے ساتھ قرأت سبعہ وعشرہ کی تعلیم ہونے لگی۔ پھر یہ امتیاز اللہ تعالی نے اس ادارہ کوعطا فرمایا کہ اگرکسی کوقرأت کی تعلیم حاصل کرنی ہے تو وہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ کارخ کرتا اور وہاں حضرت قاری مشتاق احمد پرتاب گڑھی سے فیض یاب ہوتا اوران کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرتا۔

حفظ وقرأت کا یہ امتیاز ایسا گہرا ثابت ہوا کہ اللہ تعالی نے اس کوقراء کا بھی مرکز بنادیا، اور حضرت قاری مشتاق احمد رئیس القراء کے لقب سے ملقب ہوئے، اس کی تقریب یہ ہے کہ سال میں قاری صاحب ایک محفل قرأت منعقد کرتے تھے، جس میں ملک کے نامور قراء شریک ہوتے، اور وہ اپنی روحانی وایمانی تلاوت سے سامعین اور حاضرین کومنور کرتے تھے، قاری صاحب محفل قرأت سے پہلے ایک دینی خطاب بھی رکھتے تھے، اس میں قرآن کی اہمیت، فضیلت اور پیغام پر بیانات ہوتے تھے، کئی بار قاری صاحب نے مجھے بھی اس محفل قرأت میں مدعو کیا، اور میں نے اس میں حاضری کو اپنے لئے سعادت کا باعث سمجھا اور اللہ نے جوتوفیق دی اس موضوع پر خطاب بھی کیا۔

مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں حفظ وقرأت کے ساتھ ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق عالیہ ثانیہ کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلباء وہاں سے تعلیم مکمل کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء آتے ہیں، اور سند فراغت حاصل کرتے ہیں، یہ شعبہ عربی درجات بھی قاری صاحب کا بہت مقبول ومشہور ہے، اس میں طلباء کا داخلہ قاری صاحب بآسانی کر لیتے تھے، اور ان کو مایوس نہیں کرتے تھے، ان کا وظیفہ بھی جاری کر دیتے، بعض طلباء مساجد میں قیام کر کے وہاں تعلیم حاصل کرتے تھے، اور باکمال بننے کی کوشش کرتے، قاری صاحب ان کا بھی تعاون کرتے تھے، قاری صاحب کے یہاں کوئی محروم نہیں رہتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس مختصر مدت میں مدرسہ عالیہ عرفانیہ سے عربی درجات کے فارغین کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں تک پہنچ گئی، بحمد اللہ وہ ملک کے نامور تعلیمی اداروں میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس میں حضرت قاری مشتاق احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص، قربانی اور غیر معمولی جدوجہد کا اثر ہے۔

مدرسہ عالیہ عرفانیہ کے ۳۵/سال مکمل ہونے پر حضرت قاری مشتاق احمد صاحب نے ایک جشن تعلیمی منعقد کیا تھا، جس میں ملک کے علماء وقراء شریک ہوئے تھے، اس موقع پر ایک سووینیر نکالا گیا تھا، اس میں قاری صاحب نے مجھ سے مضمون کا مطالبہ کیا تو میں نے ایک مضمون (مدرسہ عالیہ عرفانیہ: اخلاص عمل اور جہد مسلسل کا شاہکار) کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا، اور اس جشن میں بھی میری حاضری ہوئی تھی۔ قاری صاحب نے بہت اچھے انداز میں اس کو منعقد کیا، اس کے ذریعہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ کا شہرہ مزید وسیع ہوا۔

ایک اور خوشگوار موقع تھا جب ندوہ کے مہمان خانہ کی لان میں ایک کتاب جو حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڑھی کی سوانح پر مرتب کی گئی تھی، قاری صاحب نے اس کو شائع کرایا تھا، اس کی رسم اجراء ندوہ میں عصر کی نماز کے بعد ہوئی، قاری صاحب اپنے متعلقین کے ساتھ اس پروگرام میں موجود تھے، اور ہم لوگوں نے بھی اس نورانی منظر سے فائدہ

اٹھایا، وہ جلسہ ایک یادگار ہے، جس میں قاری صاحب کی محنت وکوشش سے ایک دستاویزی کتاب منظر عام پر آئی۔

اسی طرح الہ آباد میں رابطہ ادب اسلامی کے زیر انتظام ایک پروگرام بیت المعارف کے احاطہ میں شیخ طریقت حضرت مولانا قمر الزماں الہ آبادی کی دعوت پر منعقد ہوا ،تو اس میں ملک سے متعدد مقالہ نگار شریک ہوئے ، یونیورسٹیوں کے پروفیسران اور مدارس کے اساتذہ نے اس میں حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڑھی کی شاعری اوراس کی ادبی خصوصیات پر مقالے پیش کئے،اس درمیان قاری صاحب سے ملاقات ہوئی توانھوں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد احمد پرتابگڑھی کے کلام کے بارے میں کہا کہ ان کا کلام عارفانہ کلام ہے،جس میں اخلاص وسوز دل کی جھلک ہے۔

قاری صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لاتے تو دار العلوم کے دفتر اہتمام میں ان سے ملاقات ہوتی اوران کے احوال،اور مدرسہ کی سرگرمیوں کا علم ہوتا، وہ تاحیات مدرسہ کو ترقی دینے اوراس کے نفع کو عام کرنے میں مصروف رہے، یہاں تک کہ وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ان کی وفات کی اطلاع ملی تو ان کے مدرسہ حاضری ہوئی، اورمغرب کے بعد نماز جنازہ ایک مجمع کی موجودگی میں پڑھانے کا شرف بھی حاصل ہوا۔

قاری صاحب کے جانشیں قاری امتیاز احمد صاحب پرتاپگڑھی ان کے تمام تعلیمی اداروں کی نگرانی کررہے ہیں،اور بحسن وخوبی ان کا نظام دیکھ رہے ہیں۔میں اس موقع پر حضرت قاری مشتاق احمد صاحب کے رفع درجات کے لئے دعا گو ہوں ، اور قاری امتیاز صاحب پرتابگڑھی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنے والد ماجد کی شخصیت پر ایک عالمی سمینار کرنے کا عزم کیا ہے۔اللہ کامیابی سے ہمکنار کرے۔

مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ:

ایک بافیض عالم وداعی

مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ ایک معروف عالم دین، باکمال خطیب اور مصنف تھے، اور ایک اچھے مربی اور داعی الی اللہ بھی تھے، انہوں نے نسل نو کی تعلیم وتربیت میں پوری عمر صرف کی اور عوام وخواص کو اپنے علم وفضل سے مستفید کیا، ۱۶/ جمادی الأولی ۱۴۴۳ھ مطابق ۲۱/ دسمبر ۲۰۲۱ء کو ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی ملک کے نامور علماء میں تھے، ان کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں بریلی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم بریلی میں حاصل کی، اس کے بعد سہارنپور کا رخ کیا، جہاں جامعہ مظاہر علوم میں تعلیم حاصل کی، پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ گئے، اور سند فراغت حاصل کی، مولانا ابتداء ہی سے مولانا ابوالأعلی مودودیؒ کی فکر ونظر کے قریب رہے، اور ان کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا، ان کی کتابوں نے ہی ان کی زندگی کا رخ تبدیل کیا، جس کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند میں ان کی شمولیت ہوئی، اور پھر ترقی کرکے انہوں نے جماعت کے ملکی، بلکہ بین الأقوامی سطح کے علماء میں نمایاں مقام حاصل کیا، ان کے دورے اور اسفار امریکہ اور یورپ کے کثرت سے ہوئے، جہاں انہوں نے قرآن کریم کے پیغام کو صاف اور سادے انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا، جس کا سامعین پر گہرا اثر پڑا، پھر انہیں بار بار وہاں جانے کا موقع ملا، ان کے کچھ دروس ماہنامہ ذکری جدید دہلی میں شائع ہوئے، جن سے ان کے علمی رسوخ، اور گہرائی کا اندازہ ہوا۔ مولانا نے اپنی زندگی میں کئی اہم کارنامے انجام دیئے، جن میں سے چند کارناموں

کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

۱۔ ماہنامہ ذکری جدید یہ ایک ماہنامہ ہے، جس کو مولانا محمد یوسف اصلاحی نے ۱۹۷۲ء میں جاری کیا، اس کا مقصد اصلاح امت اور دعوت الی اللہ ہے، اس میں مولانا اصلاحی کا اداریہ کسی نہ کسی اہم موضوع پر ہوتا تھا، جس سے عوام وخواص، طلبائے مدارس فیض اٹھاتے تھے، اب بھی یہ رسالہ پورے آب وتاب کے ساتھ جاری ہے، اور اپنے مشن کو انجام دے رہا ہے، مولانا پوری زندگی اس کے مدیر اعلی رہے، اب ان کے صاجزادے جناب ڈاکٹر سلمان اسعد صاحب (زادہ اللہ توفیقا) کی ادارت میں یہ رسالہ جاری ہے۔

۲۔مولانا محمد یوسف اصلاحی ایک اچھے مصنف تھے، انہوں نے متنوع موضوعات پر کئی اہم کتابیں لکھی ہیں، جن میں آداب زندگی کو خاص شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، اور یہ کتاب ان کی عالمی شہرت کا ذریعہ بنی، آداب زندگی کے مصنف کے نام سے ان کو جانا جاتا تھا، مزید دیگر کتابوں میں اسلامی توحید، آسان فقہ، قرآنی تعلیمات وغیرہ ہیں۔

۳۔ مولانا اصلاحی نے لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک ادارہ جامعۃ الصالحات کے نام سے شہر رامپور (یوپی) میں قائم کیا، وہ ادارہ ماشاءاللہ مسلم لڑکیوں کی تعلیم میں اپنے روز اول ہی سے اہم کردار ادا کررہا ہے، اس کی فیض یافتہ عالمات پورے ملک میں طبقہ نسواں میں علمی، دینی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش ہیں، میں نے کئی بار رامپور جاکر ان کی اس دعوتی اور تعلیمی کوشش کو دیکھا، اور پہلے سے بہتر پایا، بلکہ سالانہ امتحان کے موقع پر مجھے بحیثیت ممتحن ہر سال ایک سوالنامہ بھی تیار کرنا ہوتا تھا، اور ان کے جوابات کو دیکھ کر نمبرات دینا بھی میرے ذمہ تھا۔ اس طرح جامعۃ الصالحات کی طالبات کے علمی معیار ومستوی سے ہر سال واقفیت ہوتی تھی، جس کے پیچھے مولانا اصلاحی کی کوششوں کا اندازہ ہوتا تھا اور دل میں ان کی عظمت کا احساس ہوتا تھا، مزید یہ کہ عزیز گرامی مولانا عبد

الخالق صاحب ندوی وہاں ایک عرصہ سے تدریسی امور سے وابستہ ہیں، جن کے ذریعہ جامعہ کی تعلیمی رفتاراورکوششوں کا اندازہ ہوتا رہا، مولانا اصلاحی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا بھی سفر کیا، اور یہاں کے نظام اور نصاب کو دیکھا اور ملاقات کا موقع دیا، ملکی وغیر ملکی بعض پروگراموں میں ان سے ملاقات ہوئی، جس سے ان کے علمی ودینی مرتبہ کا اندازہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ مولانا نے متنوع میدانوں میں کام کیا، اوراپنے علم وتقوی سے پوری زندگی فیض پہونچایا، ان کی وفات سے طبقۂ علماء ودعاۃ میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں اوراعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں۔

مولانا ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی ندوی: ایک مایہ ناز عالم ومحقق

متعدد ذرائع سے دنیائے علم وتحقیق کی بڑی شخصیت مولانا ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی ندوی کی وفات کی افسوسناک خبر ملی ،وہ وفات سے پہلے بیماری کے مرحلہ سے گذرے،علاج ومعالجہ کی حتی المقدور کوشش کی گئی ،لیکن قدرت کی طرف سے اتنی ہی زندگی ان کے لئے مقدر تھی ، چنانچہ انہوں نے علم وتحقیق سے معمور زندگی گذارنے کے بعد ۲۶/ محرم الحرام ۱۴۴۲ھ مطابق ۱۵/ستمبر ۲۰۲۰ءکوداعی اجل کو لبیک کہا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۵۳ء میں تعلیم حاصل کرنے آئے ،ثانویہ ثالثہ میں ان کا داخلہ ہوا،انہوں نے زمانہ طالب علمی کوایک محنتی طالب علم کی حیثیت سے گزارا،اور ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم سے عالمیت کی سند امتیازی نمبرات سے حاصل کی ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی یہی بنیادی تعلیم دیگر تعلیمی اداروں میں تعلیم جاری رکھنے کا ذریعہ ہوئی ، پھر اللہ تعالی نے ان کو شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدریس کا موقع عطا فرمایا،اس کے بعد وہ ۱۹۸۳ء میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز منتقل ہو گئے اور آخر تک اسی شعبہ سے وابستہ رہے۔

ڈاکٹر یسین مظہر صدیقی نے اسلامیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، چنانچہ وہ اسلامی موضوعات پر پوری تحقیق کے ساتھ لکھتے تھے ، سیرت نبوی کے متعدد گوشوں پر ان کی تصنیفات مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں ، مقالات تو سیکڑوں کی تعداد میں ہیں ، جو معروف علمی مجلّات مثلاً معارف اعظم گڑھ اور تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں شائع ہوئے ، مشہور کتابوں

میں مصادر سیرت، عہد نبوی میں تنظیم حکومت وریاست، بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات، شاہ ولی اللہ کی قرآنی خدمات، خطبات سرگودھا (مکی زندگی) وغیرہ۔

انہوں نے اپنی پوری زندگی میں علمی مشغلہ جاری رکھا، اور دنیاوی ٹھاٹ باٹ اور زیب وزینت سے دور رہے، اس طرح انہوں نے نسلوں کی تربیت کا کام انجام کیا، آج ان کے شاگرد بھی ان کی علمی امانت کو دنیا میں منتقل کرنے میں مصروف ہیں، اور ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد یسین مظہر ندوی مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں اور علمی دنیا کو ان کا جانشیں عطا فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

مولانا سید جلال الدین عمریؒ: افکار و آثار

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ نے علمی دنیا کی ایک نمایاں شخصیت مولانا سید جلال الدین عمریؒ کے افکار و آثار پر ایک سمینار ۱۸۔۱۹ستمبر ۲۰۲۲ء منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، بلاشبہ مولانا کی شخصیت دعوت وتحریک، تحقیق وتصنیف اور فکر وعمل کے لحاظ سے اس دور اخیر میں جامعیت کی حامل تھی، وہ ظاہر و باطن کے اعتبار سے علماء سلف کی یادگار تھے، انہوں نے ابتدا ہی سے تحقیق ومطالعہ کو اپنا موضوع بنایا، اور اس میں کمال پیدا کیا، جماعت اسلامی کے رکن کی حیثیت سے کام کیا، پھر اس کی انتظامی سرگرمیوں کی سرپرستی کی، اس کے بعد نائب امیر اور امیر جماعت اسلامی کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کی، ان سے ملت اسلامیہ ہندیہ کو بڑی رہنمائی ملی۔

مولانا سید جلال الدین عمری نے سہ ماہی تحقیقات اسلامی جاری کیا، وہ پابندی سے یہ مجلہ دفتر البعث الاسلامی ندوۃ العلماء میں بھیجتے تھے، اس تحقیقی مجلّہ نے اپنی عمر کے چالیس سال پورے کر لئے ہیں، اس مجلّہ کے ذریعہ ان کی تحقیقات ومقالات سے واقفیت ہوتی تھی، ان کے متعدد مقالات کو عربی زبان میں ترجمہ کرا کے البعث الاسلامی ندوۃ العلماء میں شائع کیا گیا، جن کو قارئین نے پسند کیا۔ مولانا عمری نے اس مجلّہ کے ذریعہ متعدد افراد کی تربیت کی، اور اب وہ مشاہیر اہل قلم میں ہیں، ان میں ایک نمایاں نام عزیز گرامی مولانا ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کا ہے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مولانا عمری سے وابستہ ہوئے، اور تاحیات ان کے ادارہ تحقیق وتصنیف میں علمی معاونت کرتے رہے، اب ان کی اس ادارہ سے وابستگی ذمہ دار کی حیثیت سے ہے۔

میں نے مولانا عمریؒ کے انتقال پر ماہنامہ البعث الاسلامی ماہ اکتوبر ۲۰۲۲ء میں اپنے ذاتی تأثرات کا اظہار کیا ہے، اور اہل خانہ کو تعزیت بھی پیش کی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا عمری کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے، اور ان کے افکار و آثار پر جس سمینار کا انعقاد ہو رہا ہے اس کو تعمیری اور مفید بنائے۔

مولانا باقر حسین قاسمیؒ:

ایک بافیض شخصیت

حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ کی وفات حسرت آیات پورے تعلیمی اور دینی حلقے میں محسوس کی گئی، وہ ملک کے جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے تھے، انہوں نے دینی تعلیم کے سلسلہ میں اپنی پوری توانائی صرف کی، اور کئی نسلوں کے ایمان کے تحفظ میں کلیدی کردار ادا کیا، اور پورے ملک میں عام طور پر اور مشرقی یوپی میں خاص طور پر اسلام کا پیغام عام کیا، اور مکاتب اور مدارس کے قیام میں خصوصی دلچسپی لی، ان کی اس دلچسپی سے لاکھوں افراد کو دینی تعلیم حاصل کرنا آسان ہوگیا۔

حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ کے کارناموں میں دارالعلوم الاسلامیہ بستی کا قیام ہے، شہر بستی میں اس ادارہ کا قیام وہاں کے باشندوں اور اطراف واکناف کے مسلمانوں کے لئے نعمت عظمی سے کم نہیں، میرا ایک سفر بستی کا مؤرخہ ۳۰؍ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ مطابق ۳۰؍نومبر ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا مرتضی مظاہری (سابق ناظر کتب خانہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء) اور مولانا عبدالنور ندوی (سابق استاذ عربی ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی معیت میں ہوا، اس موقع پر میں نے دارالعلوم الاسلامیہ کو قریب سے دیکھا، اس کے کتب خانہ اور دوسرے شعبہ جات اور اس کی عظیم الشان مسجد کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی، میں نے رجسٹر معائنہ میں اس وقت لکھا تھا:

> ''یہ ادارہ اس علاقہ میں اور ہندوستان کے بڑے مدارس میں ایک اچھی اہمیت رکھتا ہے، شعبہ تحفیظ القرآن بہت وسیع پیمانہ پر قائم ہے، اسلامی علوم

کے طلبہ کی تعداد بھی بہت ہے، اور یہاں تعلیم وتربیت کا نظام بھی بہت اچھا ہے، ابھی اس ادارہ کو قائم ہوئے بہت کم مدت ہوئی، لیکن اس نے بانی ادارہ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب کی انتھک کوششوں اور خلوص کی برکت سے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کی اور اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ہندوستان کے عظیم الشان اداروں میں شمار ہونے لگے گا۔ اللہ تعالی اس ادارہ کو ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے، اور علم ودین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ ودعوت کا مرکز بنائیں۔''

یہ آج سے اکتیس سال پہلے کی تحریر ہے، دارالعلوم الاسلامیہ اس وقت ہندوستان کے عظیم اداروں اور درسگاہوں میں ہے، طلباء کی معتد بہ تعداد اس میں زیر تعلیم ہے، اور اساتذہ بھی جذبۂ اخلاص کے ساتھ اپنے عمل میں مشغول ہیں، ان حصولیابیوں اور کامرانیوں کے پیچھے حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمی کی روح کارفرما ہے، انہوں نے جس جذبہ اور تڑپ کے ساتھ اس دارالعلوم کو قائم کیا، بحمد اللہ یہ دارالعلوم اس میں ہر طرح کامیابی کی طرف رواں دواں ہے۔

راقم سطور نے حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ کے انتقال (۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء) کی مناسبت سے ندوۃ العلماء کے ترجمان البعث الاسلامی میں ان سے متعلق اپنے تأثرات کا اظہار کیا تھا، جو شعبان ورمضان کے شمارہ ۱۴۳۲ھ میں شائع ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ اپنی ذات میں انجمن تھے، وہ صرف ایک دارالعلوم کے بانی اور مؤسس نہیں تھے، بلکہ کئی اداروں اور درسگاہوں کے سرپرست تھے، انہوں نے لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا، اور مدرسہ عائشہ للبنات قائم کیا، وہ جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد کے مہتمم بھی رہے، اور بڑی دیانت وامانت کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو ادا کیا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کا والہانہ تعلق تھا، اور وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات کے لئے ندوۃ العلماء آتے، تو ہم لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی اور تبادلہ خیال ہوتا''۔

حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ ملک کی دینی اور ملی تنظیموں اور اداروں کے رکن بھی تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے ان کی وابستگی بحیثیت رکن تاحیات رہی، دینی تعلیمی کونسل کے کاموں میں وہ پیش پیش رہتے، ضلع بستی میں دینی تعلیمی کونسل کے اجتماعات کے انتظام وانصرام میں ان کی سرگرمی قابل تحسین ہوتی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ دینی تعلیمی کونسل کے پروگرام میں بستی تشریف لئے گئے تو دارالعلوم الاسلامیہ کو حضرت مولانا باقر حسین قاسمی کی دعوت پر زینت بخشی، حضرت مولانا کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا محمد مرتضی مظاہریؒ بھی تھے۔ مولانا باقر حسین صاحب ان کے علاوہ کئی اداروں کے رکن تھے، انہوں نے اپنے ادارے سے ''فکر اسلامی'' کے نام سے ایک دینی، اصلاحی اور علمی مجلّہ بھی جاری کیا، جس کی ادارت ان کے فاضل صاجزادے جناب مولانا محمد اسعد قاسمی زید مجدہم (ناظم دارالعلوم الاسلامیہ) انجام دے رہے ہیں، ان کے دوسرے صاجزادے مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی بھی '' الولد سر لأبیہ'' کے مصداق ہیں، وہ جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد کے مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں، اور کئی کتابوں کے مترجم، مصنف اور اچھے خطیب ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا باقر حسین قاسمیؒ کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں، اور ان کے درجات بلند فرمائیں اور ان کے ورثاء کے ان کے لگائے ہوئے چمن کی آبیاری کرتے رہنے کی توفیق مرحمت فرمائیں۔

الحاج مظفر کولاؒ:

ایک مخلص اور وفا شعار شخصیت

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيّد الأنبياء والمرسلين محمد وعلى وآله وصحبه أجمعين:

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کے بعد بہت سی عرب شخصیات اور عالم عربی کے علمائے دین اور وہاں کے اہل علم وحکومت نے ندوۃ العلماء کو پہلی مرتبہ دیکھا اور وہ اس کے پیغام میں علم وحکمت اور دعوت وتربیت کے اسلامی طریقہ سے واقف ہوئے۔ وزارت شارقہ کے عالم کبیر اور وہاں کی معروف دینی اور علمی شخصیت شیخ عبداللہ علی المحمود ایک ایسے وقت میں ندوۃ العلماء کی زیارت کے لئے تشریف لائے، جب کہ حضرت العلام ہمارے شیخ ومرشد مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ پڑوسی ملک میں اپنے شیخ طریقت کے ساتھ تربیتی سفر پر تشریف لے جا چکے تھے، پھر پچاسی سالہ جشن ندوۃ العلماء میں شریک ہوئے اور حاکم شارقہ شیخ خالد بن محمد القاسمی کے پیغام کو سنایا، وہ ان کے معتمد علیہ اور ان کے خصوصی محبین میں شمار کئے جاتے تھے اور شارقہ کے دینی امور اور وہاں کے اوقاف کے مدیر اعلیٰ تھے، نیز اس وقت امارات کے تمام ذمہ داران سے ان کے گہرے تعلقات تھے اور ان کے ہر مشورہ پر سنجیدگی سے غور کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء کا تعارف شیخ خالد بن محمد القاسمی اور دیگر امرائے امارات سے کرانے میں ان کا بڑا حصہ تھا، اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے درخواست کی تھی کہ ندوۃ العلماء کی نمائندگی کرنے اور اس کی انفرادیت اور

عظمت کا تعارف کرانے کے لئے کسی نمائندے کو امارات کے دورے پر بھیجنے کا فیصلہ کریں ، جو صحیح طریقہ سے ندوۃ العلماء اور اس کے روح رواں حضرت علامہ ابوالحسن علی ندوی کی خدمات کا تعارف کرا سکے، چنانچہ قرعۂ فال اس حقیر کے نام نکلا اور سب سے پہلے ۱۹۶۹ء میں شارقہ جانے کا اتفاق ہوا، اور شیخ عبداللہ المحمود کی ضیافت میں قیام کر کے دیگر امور اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، وہ امارات کے حکام اور وہاں کے صاحب وجاہت لوگوں سے ملاقات کراتے تھے، حاکم ابوظبی کے مشیر ثقافت جناب ڈاکٹر عزالدین ابراہیم اور وہاں کے دیوان حاکم کے مدیر شیخ علی ریاض صاحب سے انہیں نے ملاقات اور تعارف کرایا تھا، اس کے علاوہ عجمان کے حاکم شیخ راشد النعیمی مرحوم کی خدمت میں مجھے لے کر گئے تھے، اور امارات کے بڑے علماء اور وجہاء سے بھی انہیں کے ذریعہ ملاقاتیں ہوئی تھیں، ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق صاحبزادگان اور وفادار بھائیوں نے ان کی یادگار کے طور پر ان کے ذاتی نئے مکان میں لائبریری قائم کرنے کا ارادہ کیا، اور حضرت مولانا کو اس کی تاسیس اور افتتاح کے لئے دعوت دی، ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سالم بن عبداللہ المحمود، ڈاکٹر علی بن عبداللہ المحمود، ڈاکٹر محمد بن عبداللہ المحمود، اور ان کے بھائیوں میں جناب شیخ محمد بن علی المحمود اور شیخ سالم بن علی المحمود اور شیخ احمد بن علی المحمود سب ان کو اپنا بڑا اور مربی تسلیم کیا، اور اس بات پر سب نے اتفاق کیا کہ ان کے نام سے ''مکتبۃ الشیخ عبداللہ علی المحمود'' قائم کیا جائے اور اس کا افتتاح حضرت مولانا علی میاں صاحب اور شارقہ کے حاکم شیخ سلطان القاسمی کے ہاتھوں کیا جائے۔

حضرت مولانا اپنے رفیق سفر جناب مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ اس تقریب میں موجود تھے، شیخ سلطان القاسمی کے علاوہ امارات کے حکام نے بھی شرکت کی، رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عمر عبداللہ نصیف بھی اس موقع پر تشریف لائے تھے۔

اس مکتبہ کے افتتاح کے موقع پر حضرت مولانا نے ایک تقریر فرمائی، جو حاضرین

کے لئے معلومات سے بھرپور تھی، اس میں مسلمانوں کا ذکر کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانوں کے تعمیر کو تاریخ کی روشنی میں کیا گیا، اس موقع پر یہ ایک یادگار تقریر کی تھی، اس سفر میں جامعۃ العین کی یونیورسٹی میں جس کا نام اب جامعۃ الامارات ہے، حضرت مولانا نے ایک تقریر فرمائی جس کا عنوان تھا: ''عہد حاضر کا حقیقی خلا اور اس کو پر کرنے کی ضرورت'' یعنی ایک ایسے مثالی اسلامی معاشرہ کا فقدان، جو ملک وحکومت کی سطح پر اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات کا نمونہ پیش کرے، یہی وہ خلا تھا جو دور جاہلیت میں بہت محسوس طریقہ سے موجود تھا اسلام نے آکر اس خلا کو پر کیا، جامعۃ الامارات کے گرلس کالج میں بھی مسلم معاشرہ کی تعمیر میں خواتین کے خصوصی کردار کے موضوع پر تقریر کی، مسجد سیدنا سعد بن ابی وقاص میں بھی تقریر فرمائی، اس عنوان تھا'' الی الاسلام من جدید'' اور مختلف مقامات پر مجلسوں اور گفتگوؤں کا سلسلہ قائم رہا۔

وہیں سے ۲۳رنومبر ۱۹۸۳ء کو کویت کے لئے روانگی ہوئی، وہاں کی وزارت اعلام کی طرف سے ''اسلام اور انسانی تمدن'' کے موضوع پر تقریر کرنے کے لئے حضرت مولانا کو دعوت دی گئی تھی، اس کا تعلق پندرہویں صدی ہجری کی تقریبات سے تھا، حضرت مولانا نے وہاں اپنا عربی مقالہ ''الاسلام والحضارۃ الانسانیۃ'' پڑھ کر سنایا، جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی کویت کی طرف سے عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے موضوع پر علماء، ادباء، نوجوان داعیوں اور دانشوروں کے بھرپور مجمع میں تقریر ہوئی، یہ تقریر بھی اس موضوع پر بہت ہی مؤثر اور مفید ثابت ہوئی اور اس کی گونج ایک عرصہ تک وہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں باقی رہی۔ وہاں سے پھر حرمین شریفین کا سفر ہوا، اور دو ہفتہ گذارنے کے بعد واپسی ہوئی۔

راقم الحروف کو امارات کے سفر کا موقع بار بار پیش آیا، اور بہت سے ایسے لوگوں اور جماعتوں کو جو ندوۃ العلماء کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، ان کو ندوۃ العلماء کے قیام کا مقصد اس کے بانی اور اس کے بنیادی کارگذاروں اور علم وعمل، دعوت وثقافت کے

میدان میں اس کے کارنامے کا تعارف پیش کرنے کا سلسلہ ہر طبقہ میں جاری رہا، اس کام میں ہر طبقے کے لوگوں نے ساتھ دیا، خاص طور سے ہندوستان میں بھٹکل کے علاقے کے لوگوں نے ندوۃ العلماء کے رقبۂ تعارف وعمل کو پھیلانے میں بڑا تعاون کیا، ان میں وہاں کی ایک بڑی شخصیت جناب محی الدین منیری صاحب جو بمبئی میں حج ہاؤس کے کاموں میں مصروف تھے، اور ان کو ندوۃ العلماء کی اہمیت کا اندازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ملاقات کے بعد ہوا، پھر یہاں آکر کچھ وقت گذارنے کی تمنا کرنے لگے، اور بالآخران کا یہ خواب پورا ہوا، اور وہ ندوۃ العلماء کو دیکھ کر اور یہاں کی فضاؤں میں کچھ وقت گذار کر اس کی اہمیت کو نہ صرف معترف ہوئے، بلکہ اس کے شیدائی بن گئے، وہ نہایت پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

انھیں کے ذریعہ بھٹکل اور اس کے گرد ونواح کے لوگ ندوۃ العلماء کی بنیادی اہمیت سے باخبر ہوئے، خاص طور سے وہ حضرات جو امارات میں تجارتی سرگرمیوں میں مصروف تھے، اور ان کے اندر اس ادارہ کو قریب سے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ان میں سرفہرست جناب مظفر کولا صاحب تھے، ان سے میری ملاقات عربی میں ایک مناسب موقع پر ہوئی تھی، اور میں نے ان سے ندوۃ العلماء کا تعارف اور اس کا تعارفی کتابچہ اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی کچھ کتابیں ہدیہ میں پیش کیں، اس کے بعد وہ اپنے ہی ادارہ کے لئے حرکت میں آگئے، اور بہت سے بڑے اہل علم وتجارت سے میری ملاقات کرائی، اور وہ ندوۃ العلماء کے ترجمان بن گئے، انھوں نے ندوۃ العلما کی ایک تعلیمی شاخ بھٹکل میں قائم کی، جو عربی اور دیگر زبانوں کی تعلیم کا مرکز بنا، اور اس سے مخلوط تعلیم کے میدان میں ایک اچھے ادارہ کی حیثیت کے متعارف ہوئے، اور اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے وہاں داخل کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہوا۔

مظفر کولا صاحب کو ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں، یہاں کے اساتذہ اور علماء سے

بڑی عقیدت ہوگئی، اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے بڑے بیٹے کو یہاں کی تعلیم سے مستفید ہونے اور علم وعمل کے میدان میں ترقی کرنے کے لئے بھیجا، اور یہ سلسلہ تاوفات قائم رہا، ان کے بعد ان کے اہل تعلق اور صاحبزادے اس کام کو الحمد للہ انجام دے رہے رہیں۔

افسوس کے ساتھ عرض ہے کہ ہمارے ادارے کے بہی خواہ اور ادارے کے ذمہ داران حضرات سے نہایت مخلصانہ تعلق رکھنے والے محترم الحاج مظفر کولا اللہ تعالی کے حکم سے یوم چہارشنبہ ۳۰/ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۲/جولائی ۲۰۲۰ء کو دار فانی سے عالم آخرت کو منتقل ہو گئے۔

مرحوم دبئ میں اپنے عہد شباب ہی سے ایک باشرع اسلامی تاجر کی حیثیت سے مقیم رہے، اور اخلاص وللّٰہیت کے جذبہ سے دینی اور رفاہی کاموں میں حصہ لیا، وہ اسلامی اداروں کے بڑے خیر خواہ اور مدد کرنے والے تھے، ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق مثالی تھا، ندوۃ العلماء کی فکر اور اس کے تعلیمی نظام کے بڑے قائل تھے، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو اپنا روحانی سرپرست تصور کرتے تھے۔ راقم الحروف سے بھائی مظفر کولا کی پہلی ملاقات ۱۹۶۹ء میں دبئ میں ہوئی اور یہ گہرے تعلق میں تبدیل ہوگئی، ان کا انتقال دینی کاموں میں حصہ لینے والے ایک عظیم شخص کا انتقال ہے، جس کے اثرات ہر سطح پر محسوس کئے گئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی بھائی مظفر کولا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کے ذریعہ دینی اداروں کے فروغ میں جو بھی کوششیں ہوئی ان کو ان کی ترقی درجات کا ذریعہ بنائے اور ان کے پسماندگان کو ان کے نقش قدم پر چلائے۔

مولانا مبارک حسین ندوی

متحرک وفعال عالم دین

مولانا مبارک حسین ندوی نیپالی کا ۱۸/ اگست ۲۰۲۰ء مطابق ۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۴۱ھ بروز منگل گورکھپور علاج کے لیے جاتے وقت راستے میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مبارک حسین ندوی نے ابتدائی تعلیم گھر کے مکتب میں پھر قریب کے ایک مدرسہ میں حاصل کی، ثانویہ کی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اور فراغت تک اس کے علمی اور دینی ماحول سے فیض حاصل کیا، اسی طرح دوسرے اداروں میں بھی تعلیم حاصل کی، تعلیم مکمل کر کے اپنے وطن مدھولیا نیپال گئے اور نورالعلوم نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، اور مدرسے کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلیمی الحاق کرانے کے لئے درخواست دی جو منظور ہوگئی۔

کچھ عرصہ کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ مدرسہ نورالعلوم گئے، مدرسہ کی فضا میں کچھ وقت گزارا، وہاں کی مسجد میں نماز ادا کی، جس میں راقم الحروف بھی شامل ہے، ماشاءاللہ مدرسہ نے ترقی کی، اور وہاں سے تعلیم مکمل کر کے طلباء دارالعلوم آنے لگے۔ مدرسہ میں اس وقت عالیہ ثانیہ تک کی تعلیم ہوتی ہے، اور طلباء محنت وتوجہ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس طرح دارالعلوم کے معتبر ملحقہ مدرسوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

مولانا مبارک حسین ندوی نے اس مدرسہ کا حلقہ وسیع کیا، مسلم بچیوں کی تعلیم کے لئے بھی ادارہ قائم کیا، جو مدرسہ فاطمہ للبنات کے نام سے ہے اور وہاں بھی تعلیم جاری ہے، اسی طرح مکاتب کے قیام میں بھی دلچسپی لی، کئی مکاتب کی کفالت خود کرتے تھے، ان

مکاتب سے طلباء تعلیم حاصل کر کے مدرسہ نور العلوم آتے اور اعلی تعلیم حاصل کرتے، علاقے میں تبلیغی اور اصلاحی دورے بھی مولانا مبارک صاحب کرتے تھے اور عوام کی رہنمائی کرتے تھے۔

مولانا مرحوم بزرگوں اور علمائے ربانیین سے گہرا تعلق رکھتے تھے، وعظ و ارشاد، دعوت و اصلاح اور لوگوں کی عملی تربیت کے لیے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے اجازت و خلافت حاصل تھی ،ان کے بتائے ہوئے ارشادات کے مطابق وہ اپنا معمول جاری رکھتے تھے۔

ہم مدرسہ نور العلوم کے اساتذہ وطلباء، مرحوم کے اہل وعیال اور اعزہ و اقارب، خصوصاً مولانا کے خواہر زادہ برادر مکرم مولانا محمد فرمان ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) سے تعزیت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی مرحوم کی تعلیمی خدمات اور علاقے میں دینی تعلیم کے لئے مخلصانہ کوششوں کو قبول فرمائے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دامن رحمت میں جگہ عطا فرمائے ،ان کے گناہوں کو معاف فرمائے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین، وَمَن يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانا تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کی)۔

(ترجمہ از ماہنامہ البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء ستمبر ۲۰۲۰)

حضرت مولانا یوسف متالا رحمۃ اللہ علیہ:

ایک بافیض شخصیت

حضرت مولانا یوسف متالا رحمۃ اللہ علیہ ایک بافیض شخصیت تھے، وہ حضرت شیخ الحدیث کے خادم خاص، شاگرد، بلکہ مجاز بیعت تھے، حضرت شیخ الحدیث کا فیض اللہ تعالی کے فضل سے عرب وعجم میں پہونچا، اور ہر جگہ ان کے ماننے والے پائے گئے، اورانہوں نے علم دین کی روشنی پھیلانے میں پوری توانائی صرف کی، اورنسلوں کو فائدہ پہونچایا، حضرت مولانا یوسف متالا انہیں خوش نصیب افراد میں تھے، جن کے ذریعہ اصلاح وتربیت کا یہ کام انجام پایا، انہوں نے ایک طرف اصلاحی وتربیتی کام کیا، تو دوسری طرف علمی و دعوتی کاموں پر توجہ دی، اورصحیح معنوں میں حضرت شیخ الحدیث کی نیابت وخلافت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت مولانا یوسف متالا نے ایک دینی گھرانے میں آنکھیں کھولیں، ابتدائی تعلیم قریب کے ایک مکتب میں حاصل کرکے جامعہ حسینہ راندیر میں داخلہ لیا، اورعلوم اسلامیہ کی اہم کتابیں وہیں پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور آئے، جہاں صحاح ستہ کا درس لیا، اورصحیح بخاری حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے پڑھی، حضرت شیخ کا نقش ان کی شخصیت پر ایسا پڑا کہ انہیں کے ہوکر رہ گئے، اوران سے روحانی فیوض وبرکات بھی حاصل کیا۔

فراغت کے بعد اپنے علاقہ سورت میں رہے، پھر انگلینڈ کا سفر کیا، اور یہ سفر بڑا مفید اورعلمی فتوحات سے معمور رہا کہ انہوں نے وہاں نئی نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے

حضرت شیخ کے ایماء پر ایک دارالعلوم قائم کیا، جہاں سے ہزاروں افراد علوم اسلامیہ حاصل کر کے دین کی خدمت میں مشغول ہیں، امریکہ، کینیڈا اور انگلینڈ کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو، جہاں اس کے فضلاء موجود نہ ہوں، اب بھی ماشاء اللہ یہ دارالعلوم دینی علوم کی نشر واشاعت میں مصروف ہے۔

حضرت مولانا یوسف متالا کے علمی کاموں میں ایک اہم کام ترجمہ قرآن ہے، وہ اضواء البیان فی ترجمۃ القرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے، مولانا یوسف متالا چونکہ اپنے قائم کردہ دارالعلوم میں تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے، اور طلباء ان دروس کو نقل کرتے تھے، اس طرح طلباء کے پاس ترجمہ قرآن کی بیاض جمع ہوگئی، پھر اس کی طباعت کا اہتمام ہوا، اس طرح ایک مفید ترجمہ قرآن سامنے آیا، جو اہل علم کے لئے قیمتی سوغات ہے۔

حضرت مولانا یوسف متالا کا اصل تعلق تو حضرت شیخ الحدیث سے تھا، لیکن وہ اپنے وقت کے بزرگوں سے ربط رکھتے تھے، ان سے براہ راست استفادہ کے لئے سفر کرتے، اور ان کے علمی وروحانی سرچشمہ سے فیض اٹھاتے تھے، کبھی ان سے مراسلت کا تعلق رکھا، ماشاء اللہ مراسلت کے ذریعہ ان کے پاس بزرگوں کے بہت سے خطوط جمع ہو گئے، جن کو انہوں نے (عنایت نامے) کے نام سے شائع کیئے، وہ اہل معرفت کے لئے سرمۂ چشم ہیں۔

غرض یہ کہ حضرت مولانا یوسف متالا نے ایک کامیاب زندگی گذاری، علمی، عملی، روحانی، ان تینوں شعبوں میں ان کے نقوش گہرے ہیں، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائیں اور اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائیں اور بعد میں آنے والی نسلوں کو ان کے کاموں کی تقلید کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

تذکرہ علمائے نگرام

دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ التفسیر علامہ محمد اویس نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں میں بغرض استفادہ برابر شرکت کا موقع ملا، اور انہوں نے اپنے شیخ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیر تربیت رہ کر علوم قرآن کے بارے میں جو فوائد اکٹھا کئے تھے، ان سے اس وقت کے ہم طلبائے دار العلوم کو مستفید ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔

شیخ التفسیر رحمہ اللہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی دعوت پر ۱۹۴۵ء میں دار العلوم آئے، اور طلباء کو تفسیری فوائد ودروس سے مستفید کرنے کا خاص اہتمام فرمایا، اور احاطہ دار العلوم میں پہلے ایک معمولی مکان میں قیام فرما کر درس وافادہ کا سلسلہ شروع فرمایا، چنانچہ بہت سے طلباء ان کے تفسیری فوائد سے مالا مال ہوئے، شیخ التفسیر کی اہمیت کے پیش نظر ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے ان کے لئے اطمینان بخش قیام گاہ کے لئے دار العلوم کے پرسکون مشرقی حصہ میں ایک شایان شان مکان تعمیر کرایا، اور اس اطمینان بخش جگہ پر قیام فرمانے کی وجہ سے حلقۂ مستفیدین وسعت پذیر ہوا، اور روزانہ عصر کی نماز کے بعد اساتذہ اور طلبہ کو حاضر مجلس ہو کر تفسیری فوائد کی روشنی میں علمی طور پر مستفید ہونے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی اور دینی مشغولیات کے بارے میں ان کی معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مقبول اور مشہور تفسیری مجموعہ (التفسیر القیم) بذات خود ایک عظیم تفسیری کام ہے، جس سے عرب وعجم ہر جگہ فائدہ اٹھایا گیا، یہی وجہ ہے کہ اہل علم اور طلبائے عزیز بھی اس مجلس میں تفسیری سوالات کیا کرتے تھے، اور اطمینان بخش جواب سے وہ علمی فوائد اور

بالخصوص تفسیری مسائل میں دوسرے ساتھیوں کو بھی فائدہ پہونچاتے تھے، ہندو بیرون ہند کے مختلف علاقوں سے ندوۃ العلماء کی زیارت اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمہ اللہ) سے ملاقات کی غرض سے اہل علم آتے تھے، وہ بھی شیخ التفسیر کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے، بعض دفعہ عرب اہل علم ندوۃ العلماء کے علماء اور یہاں کے شیوخ سے ملنے آئے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرکے اپنی مسرت اور ندوہ کی اہمیت میں اضافہ کا باعث بنے۔

قصبہ نگرام اپنی عظیم علمی خصوصیتوں کی بنا پر ایسے مثالی علمائے دین ودعوت پیدا کرنے میں صدیوں سے معروف تھا، اور علمائے بلند پایہ کی ایک طویل فہرست ہے، جن کا تذکرہ مرتب کرنا تاریخ کی امانت ادا کرنے کے لئے بہت ضروری تھا، اسی بنا پر ہمارے محبّ مکرم جناب ڈاکٹر پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (فرزند اکبر شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی صاحب رحمہ اللہ) نے اس اہم پہلو کی طرف توجہ کی اور علمائے نگرام، ان کی دینی، دعوتی اور علمی خدمات کے موضوع پر پہلا رسالہ تیار کیا، اور زیور طباعت سے وہ مزین ہوا، اس میں اکثر علمائے نگرام کے تذکرے اختصار کے ساتھ آگئے، چند شخصیات کا ذکر باقی رہ گیا تھا، اس کمی کی طرف پروفیسر نگرامی کے صاحبزادگان نے توجہ کی، اور جملہ علمائے نگرام کا تذکرہ جمع کر کے نہایت مرتب انداز میں اس مجموعہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

سب سے زیادہ ان کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر عمار انیس نگرامی صاحب نے اس خدمت کو انجام دینے میں اپنا وقت صرف کیا، اور اس تذکرہ کی ترتیب میں خانوادۂ نگرامی کے دیگر ساتھیوں اور بھائیوں کا ذکر کر کے اسے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا ہے، اور سوانحی کتب خانہ میں اضافہ کی خدمت انجام دی ہے۔

تذکرہ علمائے نگرام کے اس مجموعہ کے مؤلف محترم کو میں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس کو قبولیت عطا فرمائیں اور نہ

صرف طلبائے علوم دینیہ کے لئے ، بلکہ علمائے دین کی معلومات میں بھی اضافہ کا ذریعہ قرار دیں۔

اس کتاب کی ترتیب وطباعت کے سلسلہ میں مؤلف جناب عمار انیس صاحب کے بھائیوں اور خصوصاً ان کے صاحبزادے احمد اویس نگرامی نے بھرپور تعاون کیا ، اور پوری طرح ساتھ رہے۔

امید ہے کہ یہ مجموعہ تفسیری مکتبہ میں ایک خوشگوار اضافہ کا باعث ہوگا ، اور ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی خاص طور سے زینت بنے گا۔ان شاءاللہ۔

عالی جناب احمد حسن صاحب:
متنوع خوبیوں کی حامل شخصیت

ہر زمانہ میں صحیح انسانی اقدار کو فروغ دینے والے افراد معاشرہ انسانی میں پائے جاتے رہے ہیں، انھوں نے انسانوں قدروں کی نہ صرف یہ کہ حفاظت کی بلکہ ان کو عوام و خواص کے درمیان بلا اختلاف مذہب وملت عام کیا، انھیں میں ایک نمایاں نام مشہور قائد ورہبر عالی جناب احمد حسن صاحب کا ہے، بنیادی طور پر ان کا تعارف ایک سیاسی پارٹی کے نمائندہ کے طور پر ہے اور اس کے ریاستی سطح پر ایک قابل احترام وزیر رہ چکے ہیں، اور اس کے واسطہ سے بے شمار قابل فخر کام انجام دے چکے ہیں، اور متعدد بار سیاسی ایوانوں میں عزت و وقار کے ساتھ نمائندگی کرتے رہے ہیں، لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایک صاحب دل انسان کی حیثیت سے انسانی معاشرہ میں مشہور رہے ہے، کوئی بھی ان کا دروازہ کھٹکھٹائے، کوئی بھی ان کو آواز دے، ملک کے کسی گوشے میں کوئی قہر آسمانی یا آفت زمینی پیش آئے، یا سیاسی اتار چڑھاؤ کی بات ہو وہ سد سکندری بن کر قوم وملک کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

جناب احمد حسن صاحب کی شخصیت میں متعدد خوبیاں جمع ہیں: ایک انصاف پسند قائد، گہری سمجھ بوجھ رکھنے والے سیاست داں، علماء کی قدر کرنے والے، مدارس اور اہل مدارس کے مرتبہ کو پہچاننے والے، برادران وطن کے درمیان مثبت فکر ونظریہ کے لحاظ سے متعارف ہیں، ندوۃ العلماء اور اس کی عظیم شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بے پناہ عقیدت ومحبت رکھنے والے تھے، موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی سے بھی یہی تعلق قائم ہے، ندوۃ العلماء کا کوئی مسئلہ ہو اس کو حل

کرنے میں ان کی دلچسپی قابل دید ہوتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ندوہ پر ۱۹۹۴ء میں جب پولیس چھاپہ پڑا اور یہاں کے طلباء کونشانہ بنایا گیا تو جناب احمد حسن صاحب کی شخصیت تھی جو اس موقع پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپی اور مسئلہ کوحل کرنے کے لئے سرگرم ہوئی، یہی وجہ ہے کہ عالی جناب ملائم سنگھ یادو کو صحیح صورت حال کا علم ہوا، اور انھوں نے بذات خود اس میں شریک ہو کر مثالی قائد کا کردار ادا کیا، حضرت مولاناؒ نے کاروان زندگی جلد چہارم صفحہ: ۵۰ پر اس واقعہ کا تذکرہ اپنے منفرد اسلوب میں کیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ ’’ جناب احمد حسن صاحب چیر مین اقلیتی کمیشن شکریہ واعتراف کے مستحق ہیں، جنھوں نے مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی، اور ہمدردی کا اظہار کیا اور آخر وقت تک دارالعلوم کے ذمہ داروں کا تعاون کرتے رہے‘‘۔

ایسی گوناگوں خوبیاں کی حامل شخصیت اس لائق ہے کہ ان کی خدمات اور کوششوں کا اعتراف کیا جائے، اور یہ اعتراف ایمان والے کو دنیا میں ملنے والی خوشخبری ہے، جو اللہ تعالی کی طرف سے آتی ہے۔

صحیح نیت کے ساتھ ملک وملت کی خدمت نہ صرف یہ کہ ایک بہترین اور اچھا عمل ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ اور ایمان کی علامت بھی ہے۔

مولانا قاضی محمد قاسم مظفر پوری

انتہائی افسوس کہ یکم ستمبر ۲۰۲۰ء کی نماز فجر کے بعد مولانا قاضی محمد قاسم مظفر پوری کی اچانک وفات کا حادثہ پیش آیا، اس کی اطلاع پہلے ذرائع ابلاغ سے پھر قاضی صاحب مرحوم کے حقیقی بھتیجے ڈاکٹر محمد رحمت اللہ ندوی نے دوحہ قطر سے بذریعہ فون دی، اور اس افسوس ناک خبر کی تائید کرتے ہوئے انتہائی رنج وغم کا اظہار کیا، اور لاک ڈاون اور جملہ ذرائع سفر بند ہونے کی وجہ سے اس افسوس ناک حادثہ میں براہ راست شرکت کرنے اور نماز جنازہ میں حاضری کی محرومی پر شدید اظہار غم کیا۔

مولانا قاضی محمد قاسم صاحب ضلع مظفر پور بہار کے ایک بڑے رہنما عالم دین اور قاضی شریعت تھے، اور ملک کے تین صوبوں بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ میں امارت شرعیہ کی پوری نمائندگی کرتے تھے، انہوں نے اپنے ہونہار بھتیجے ڈاکٹر محمد رحمت اللہ ندوی کی تعلیم میں شروع سے دلچسپی لی، اور ندوہ میں اپنے صاحب زادہ اور بھتیجے کو حصول تعلیم کے لئے بھیجا، اور برابر نگرانی کرتے رہے، یہاں تک کہ ڈاکٹر رحمت اللہ ندوی نے ندوہ سے فراغت کے بعد سعودی عرب اور قطر میں رہ کر زبردست علمی ترقی کی، اور قاضی صاحب کے صاحبزادے کو ندوہ سے فراغت کے بعد اپنے علمی مشن میں برابر ساتھ رکھا، اور ان کی دعاؤں اور خصوصی توجہات سے ڈاکٹر رحمت اللہ ندوی نے مختلف علمی نمایاں کارنامے انجام دیئے۔

ان کی وفات علمی دنیا کے لئے زبردست خسارہ ہے، اللہ تعالی اس اخسارہ کی تلافی ان کے پسماندگان علمائے کرام سے کرادیں اور اس خلا کو پر ہونے کا انتظام فرمادیں، ندوۃ العلماء سے ان کا گہرا تعلق تھا اور یہاں کے ذمہ دار حضرات خاص طور سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ناظم اعلی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے قلبی لگاؤ تھا، اور اکثر ان حضرات کی زیارت کے لئے علمی پروگراموں میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کے مخلصانہ عمل کو قبول فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔ (آمین)

ملک کے مشہور عالم وفقیہ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ملک کے مشہور عالم وفقیہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اپنی خاموش مزاجی، اعلیٰ ظرفی، وسعت علم اور معاملہ فہمی جیسی متعدد صفات و خصوصیات سے عوام و خواص میں معروف ہیں، ان میں قول صادق اور عمل صالح کی جامعیت پائی جاتی ہے، مجھے دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کئی بار جانے کا موقع ملا، اس کے بانی حضرت مولانا رضوان القاسمی رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا رحمانی سے وہیں پہلی بار ملاقات ہوئی، ان کے علمی شغف اور متانت طبع کو دیکھ کر طبیعت پر مثبت اثر پڑا۔ اور ذہن میں ''موجودہ علماء'' کے بارے میں جو تصور تھا اس کے برعکس مولانا کی خاموش خدمات و مثبت طریقۂ عمل کو دیکھ کر میری رائے میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا ہوئی، بلا شبہ مولانا فکر و عمل اور قرطاس و قلم کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے دعوت اسلامی کے تقاضوں کے پیش نظر افراد سازی کا مہتم بالشان عمل شروع کیا، اور حیدر آباد میں "المعهد العالي الإسلامي" کے نام سے مرکز تعلیم و تربیت قائم کیا، اور طلبائے علم و دعوت کی ایک محدود تعداد کی مؤثر انداز میں تربیت دینی شروع کی، اور عام مدارس و مراکز سے مختلف اپنے علمی، تعلیمی اور دعوتی تجربات کی روشنی میں تعلیم و تربیت کا ایک بہترین نصاب تیار کیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا، وہاں سے فارغ ہونے والا ہر طالب علم ایک مبسوط مقالہ یا بالفاظ دیگر متوسط درجے کی تصنیف سال کے اخیر میں پیش کرنے کا مکلّف ہوتا ہے، جس سے اس کی مخفی صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں، یہ اس معہد علم و فکر کا ایک بڑا امتیاز ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ میں نے مولانا کو ایک وسیع النظر عالم اور عمیق العلم مربی کی حیثیت سے دیکھا اور پہچانا، مسلم پرسنل لا بورڈ کے کاموں میں ان کی دلچسپی اور مرکزیت پوری طرح نمایاں ہے، وہ دیگر مراکز تعلیم وتربیت کے ساتھ ندوۃ العلماء کی مجلس نظامت اور مجلس انتظامی کے موقر رکن ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمیذانہ تعلق رکھتے تھے، اوران کے جانشیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم سے عقیدت مندانہ رابطہ قائم ہے، ہندوستان سے باہر فقہی مراکز اور جمعیات کی رکنیت بھی آپ کو حاصل ہے، اور وہاں کے علمی سالانہ اجتماعات میں شرکت فرماتے رہتے ہیں اور طبقہ علماء میں آپ کے آراء وافکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، آپ ماشاء اللہ اپنی علمی گہرائی کے ساتھ ساتھ ورع وتقوی میں بھی ایک مؤمنانہ شان رکھتے ہیں، اور ہر طرح کی علمی اور فکری نزاہت کے ساتھ قافلہ علم وعمل کو آگے بڑھانے میں قائدانہ کردار ادا کررہے ہیں۔

اللہ تعالی طبقۂ علماء اور طالبان علوم نبوت کو ان کی وسعت علم اور اخلاص عمل اور ان کی پاکیزہ زندگی میں مزید برکت کی دعا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب

محترم گرامی منزلت جناب ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب کی شخصیت دعوتی ،فکری اور ثقافتوں میدانوں میں محتاج تعارف نہیں ہے، وہ دل دردمند کے مالک ہیں، اور ملک و ملت کے سلسلے میں ان کی یہ دردمندی ان کے عظیم کارناموں کا باعث ہے، ڈاکٹر صاحب کا وطنی تعلق تو صوبہ بہار سے ہے جس کے حالات ،ضروریات اور تقاضوں سے واقف تھے ،لیکن انہوں نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا بغور جائزہ لیا، اور اس کے مختلف طبقات سے تبادلہ خیال کیا ، ان کی پریشانیوں میں شریک رہے، ان کے ساتھ اللہ رب العزت کا مزید یہ کرم رہا کہ ان کو مملکت سعودیہ میں ایک مدت تک رہنے کا موقع ملا ، جہاں عربوں کے مزاج ،خصوصیات اور میدان عمل سے واقفیت ہوئی، ان متعدد اسباب کی بناء پر ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی ورثہ کی حفاظت کے لئے ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے ، جہاں اہل نظر اپنے افکار نئی نسل کے سامنے پیش کر سکیں، اور ماضی کے سرمایہ سے استفادہ کے ساتھ بدلتے زمانے میں قوم کی رہنمائی کر سکیں ، یہ حقیقت ہے کہ قوموں میں فکر ونظر کا زوال پہلے ہوتا ہے، اور اس کے بعد ظاہری شوکت وقوت متاثر ہوتی ہے، اس تناظر میں ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز دہلی کا قیام ایک بڑا کارنامہ ہے، اس ادارہ کے ذریعہ ابھی تک سیکڑوں کتابیں متعدد موضوعات پر سامنے آچکی ہیں، اہم اور سلگتے موضوعات پر سمینار اور کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، چھوٹی اور بڑی مفید نشستیں اور اجتماعات بھی ہوتے رہے ہیں، اس طرح ۳۴ رسال کا یہ عرصہ ہندوستانی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، جس پر ہمیں

بجا طور پر فخر کرنے کا حق ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ مجموعہ حسنات ہیں تو بیجا نہ ہوگا، وہ ایک طرف علمی ،فکری اور ثقافتی کارنامے انجام دے رہے ہیں تو دوسری طرف دعوتی ، سیاسی اور سماجی میدانوں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں، آل انڈیا ملی کونسل کے قیام سے لے کر آج تک اس کی سرگرمیوں کو وسیع پیمانہ پر عام کرنے میں ڈاکٹر صاحب کا کلیدی رول ہے، ملی کونسل اتحاد کی داعی ہے، اور سیاسی سطح پر ہندوستانی مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا رکھنا چاہتی ہے، اس لئے ہر موقع پر اس کی حکیمانہ قیادت تسلیم کی جاتی رہی ہے، ڈاکٹر محمد منظور صاحب تو اس کے ہراول دستہ میں شامل ہیں، جن کی کوشش سے جدید وقدیم طبقہ ایک اسٹیج پر جمع ہوتا ہے، اور اس میں مسلک ومشرب کی قید حائل نہیں ہوتی ہے۔

عالم اسلام، خاص طور سے ملک کی عظیم شخصیات کی خدمات کا اعتراف کرنا ایک بڑی ذمہ داری ہے، تا کہ نئی نسل کو آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے ، اور ان شخصیات کو ان کی زندگی میں ملک وملت کے سلسلہ میں اپنے کارناموں کی قدر افزائی ہو، ڈاکٹر صاحب اس پہلو سے غافل نہیں ، وہ سال میں دو سمینار ایسے کراتے ہیں، جس میں ایک عالم اسلام کی شخصیت اور دوسری ملک کی شخصیت موضوع بحث ہوتی ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ملک کی عظیم شخصیات کی خدمات کے اعتراف کا ایک اچھا سلسلہ شروع کیا، وہ ایوراڈز کی شکل میں شخصیات کو پیش کیا جاتا ہے، ان میں ایک لائف ٹائم اچیومنٹ اور دوسرے شاہ ولی اللہ ایوارڈ ، یہ دونوں سلسلے ڈاکٹر صاحب کے اخاذ ذہن کے ترجمان ہیں، میرے لئے سعادت کی بات ہے کہ مجھے بھی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ڈاکٹر صاحب نے عطا کیا ہے۔

ان خدمات کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کس طرح علم و عمل سے معمور زندگی گذار رہے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کی ۷۵ر بہاریں دیکھی ہیں،

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عمر نوح عطا کرے، تا کہ یہ عظیم کام خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتے رہیں، اور ملک وملت کو ان کے وجود سے فائدہ پہونچتا رہے۔

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات غالبا سعودی عرب کے مشہور ریاض میں ہوئی، اس کے بعد ملاقتوں اور محبتوں میں اضافہ ہوا، میں بارہا آئی او ایس کے سمیناروں میں شریک ہو چکا ہوں، بلاشبہ یہ پروگرام مقصدیت کی روح سے بھر پور ہوتے ہیں، اور دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں، ان سب کاموں کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کی مخلصانہ شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے کارناموں کو قبول فرمائیں، اور مزید ہمت وحوصلہ سے نوازیں۔

خانوادۂ علم اللّٰہی اور مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ

اس دنیائے فانی میں انسانی وجود متنوع سرگرمیوں کا مجموعہ ہے، اور انسان اپنی فعالیت اور نشاط کے ذریعہ اس کو عوام وخواص کی توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے، خاص طور سے امت مسلمہ جس کو اللہ تعالی نے منصب دعوت اور منصب قیادت سے سرفراز فرمایا ہے، اور اس کی رہنمائی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، یہ حقیقت اس کائنات میں اپنا ایک تاریخی وجود رکھتی ہے، اس امت کو پوری دنیا کی اصلاح ودعوت کے لئے برپا کیا گیا ہے، اور اس کو ایسا جامع دستور دیا گیا ہے، جس کے مماثل کوئی قانون اور آئین نہیں ہوسکتا، اب امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے اور اپنے دنیا میں بھیجے جانے کے مقصد سے واقف ہو۔

بلاشبہ دنیا کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو عقیدہ اور نظام زندگی ملا ہے، اس کو اپنائے اور اس ذمہ داری کو اپنی بنیادی ذمہ داری تصور کرے، اللہ تعالی نے سورۂ البینہ میں واضح کیا ہے: اور انہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اس کے لئے دین کو خالص کر کے اور تمام چیزوں سے یکسو ہوکر، اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور یہی سیدھا دین ہے۔ (البینۃ: ۵)

خانوادۂ علم اللّٰہی کے عالم ومصنف مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اسی عقیدہ اور پیغام کے حامل تھے، وہ نوجوان علماء میں اپنی ایک شان رکھتے تھے، خانوادۂ علم اللّٰہی کے نمایاں علماء اور مشائخ سے انہوں نے کسب فیض کیا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تربیت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا، اور ان کی کتابوں کو پڑھا اور ان کی فکر کو اپنے اندر منتقل کیا، حضرت مولانا کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندووی کے معاون علمی کے طور پر کام کرتے رہے، اور اسی کے ساتھ اپنی علمی اور تصنیفی کام کو بھی آگے

بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ متعدد موضوعات پر ان کی کئی کتابیں آ گئی۔

مرحوم محمود حسنی ندوی کا تعلق حضرت شاہ علم اللہ حسنی کے خانوادہ سے تھا، جن کی اتباع سنت کا زمانہ گواہ ہے، ان کی نسل میں حضرت سید احمد شہید کے مجاہدات اور کارناموں سے وہ واقف تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے ایمان ویقین کی باد بہاری چلا دی، ان کے ذریعہ متروک فریضہ حج زندہ ہوا، جہاد وشوق وشہادت کا جذبہ لوگوں میں پیدا ہوا، انہوں نے خود اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، لیکن اپنے پیچھے خلفاء اور مشائخ کی بڑی تعداد چھوڑی جو ان کے مشن کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، یہی وجہ ہے کہ بعض بڑے علماء کی زبانی سنا گیا کہ ہم حضرت سید احمد شہیدؒ کی تجدید کے سایہ میں جی رہے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولاناؒ نے ان کی دعوت، فکر اور عمل کو اپنے اندر منتقل کیا، اور ان کی سوانح پر ایک جامع کتاب دو جلدوں میں لکھی جو سیرت سید احمد شہید کے نام سے ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی نے پوری زندگی اسی مشن اور دعوت کو زندہ رکھا، جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے لیا تھا، وہ عام علماء اور دعاۃ کی طرح نہیں تھے، بلکہ مجددین کی فہرست میں شامل ہیں، انہوں نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) لکھ کر عالم اسلام میں ایک انقلاب برپا کیا، اور مسلمانوں کو ایک زندہ اور متحرک قوم کی حیثیت سے پیش کیا، اور ان کے اوپر چھائی ہوئی کمزوری کو دور کیا، بلا شبہ عالم اسلام کی تحریکات پر اس کتاب کا اثر پڑا، اور وہ بعض تحریکات کے نصاب میں شامل ہوئی۔

مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی اسی سنہری تاریخ کی ایک کڑی تھے، انہوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں کا تذکرہ اپنے گھر میں سنا بھی تھا، اور کتابوں میں پڑھا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کو اس پوری تاریخ کا پورا استحضار تھا، وہ کھلی کتاب کی طرح ان سے واقف تھے، ان کے اسی کمال فن کی وجہ سے حضرت مولانا سید عبد اللہ عباس ندوی نے ان کو پندرہ روزہ

تعمیر حیات ندوۃ العلماء کا معاون مدیر بنایا، وہ ایک اچھے قلم کار، کامیاب مصنف، اور کہنہ مشق صحافی تھے، مولانا کی ولادت ۲۲ جولائی ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم انہوں نے ندوۃُ العلماء کے ایک مکتب میں حاصل کی، ابتدائی عربی درجات مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، اور ثانویہ اور عالیہ کی تکمیل کی، اور حدیث شریف میں تخصص کیا، ۱۹۹۲ء میں سند فراغت حاصل کی، اور ایک سال مزید دعوہ وفکر اسلامی میں ڈپلوما کیا، اس کے بعد مدرسہ ضیاء العلوم میں تدریسی عمل سے وابستہ ہو گئے، اور دار عرفات رائے بریلی میں تحقیق وتصنیف سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ مولانا سید محمود حسنی ندوی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی خصوصی تربیت میں تھے، ان کے اسفار کی روداد (رفتار کارواں) کے نام سے قسطوں میں تعمیر حیات میں شائع کیا، لاک ڈاون کے زمانہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی آپ بیتی بڑے اچھے انداز میں مرتب کیا، جو (اوراق زندگی) کے نام سے شائع ہے۔

۲۰۰۱ء میں پندرہ روزہ تعمیر حیات کے باضابطہ معاون مدیر منتخب کئے گئے، کچھ سالوں کے بعد نائب مدیر مقرر کئے گئے، انہوں نے قیمتی مضامین اور مقالات سپرد قلم کئے، جو عوام وخواص کے لئے استفادہ کا ذریعہ ہیں، ان کی تصنیفات میں تاریخ اصلاح وتربیت (دو جلدیں)، سوانح حضرت مولانا ابرار الحق، ایک فرشتہ صفت انسان، حیات عبد الباری، سوانح مولانا سید محمد عبد اللہ حسنی ندوی، مولانا محمد یونس جونپوری: شخصیت اور خدمات، مولانا محمد زبیر کاندھلوی، وغیرہ ہیں۔ خانوادہ علم الٰہی کی کئی کتابوں کو انہوں نے ایڈٹ کیا، جو ان کی تحقیق وتعلیق سے شائع ہوئی۔ جن میں میزاب رحمت، خانوادۂ علم الٰہی مولفہ مولانا محمد ثانی حسنی وغیرہ ہیں۔

مولانا محمود حسنی ندوی ایک سال سے بیمار تھے، کئی جگہوں سے ان کا علاج ہوا،

لیکن افاقہ نہیں ہوا، آخر میں ان کو لکھنؤ کے میٹرو اسپتال میں داخل کیا گیا، میں نے اسپتال جا کر ان کی عیادت کی، طبیعت میں کچھ افاقہ کی خبریں مل رہی تھی کہ ان کی وفات بروز جمعہ ۱۳/ اگست ۲۰۲۲ء میں ہوگئی، اسپتال سے جنازہ ندوہ لایا گیا، ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ان کی نماز جنازہ ہوئی، جس کی امامت راقم الحروف (سعید الرحمٰن اعظمی) نے کی، ایک بڑے مجمع نے جمعہ کی نماز کے بعد ان کی نماز ادا کی، اور دوسری نماز جنازہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں بعد نماز عصر ہوئی، جس کی امامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے کی، انہوں نے اپنے پیچھے ایک صاحبزادی، اور اہلیہ اور دو بھائی مولانا مفتی مسعود حسن حسنی ندوی، مولانا منصور حسن حسنی ندوی کو چھوڑا۔ اللہ ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، واضح رہے کہ مولانا محمود حسن حسنی ندوی حضرت مولانا محمد ثانی حسنی (برادر اکبر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) کے حقیقی نواسے تھے، ان کے والد سید حسن حسنی اور والدہ سیدہ امامہ حسنی کا کئی سال پہلے انتقال ہوگیا۔

(مضمون ماہنامہ البعث الاسلامی، ماہ ستمبر ۲۰۲۲ء ترجمانی: محمد فرمان ندوی)

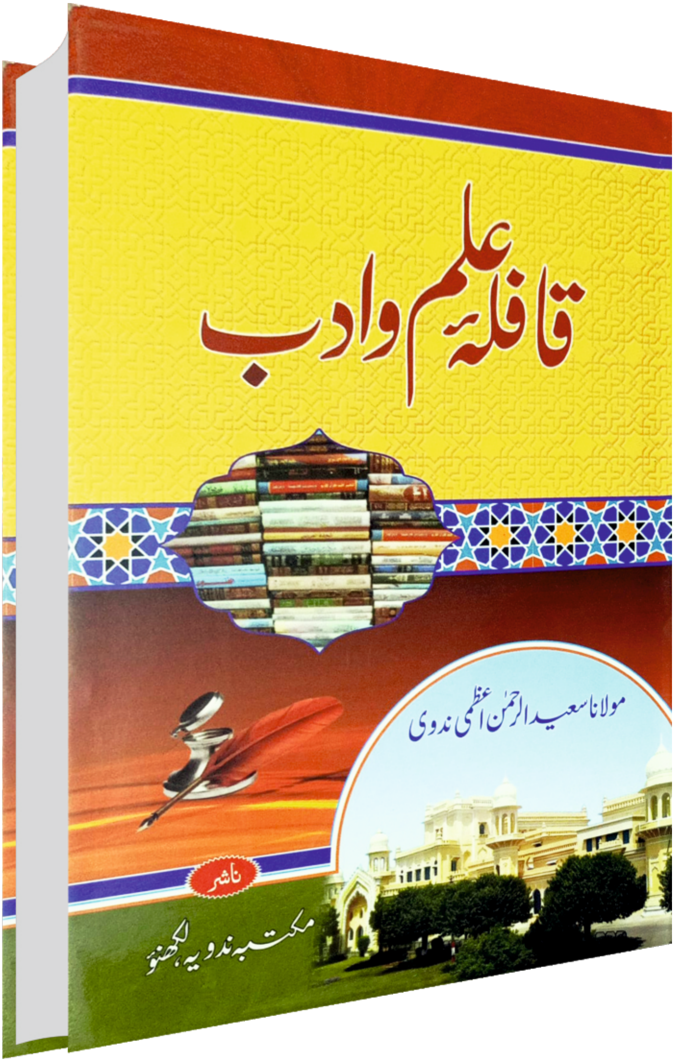
قافلۂ علم وادب
مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
ناشر
مکتبہ ندویہ، لکھنؤ

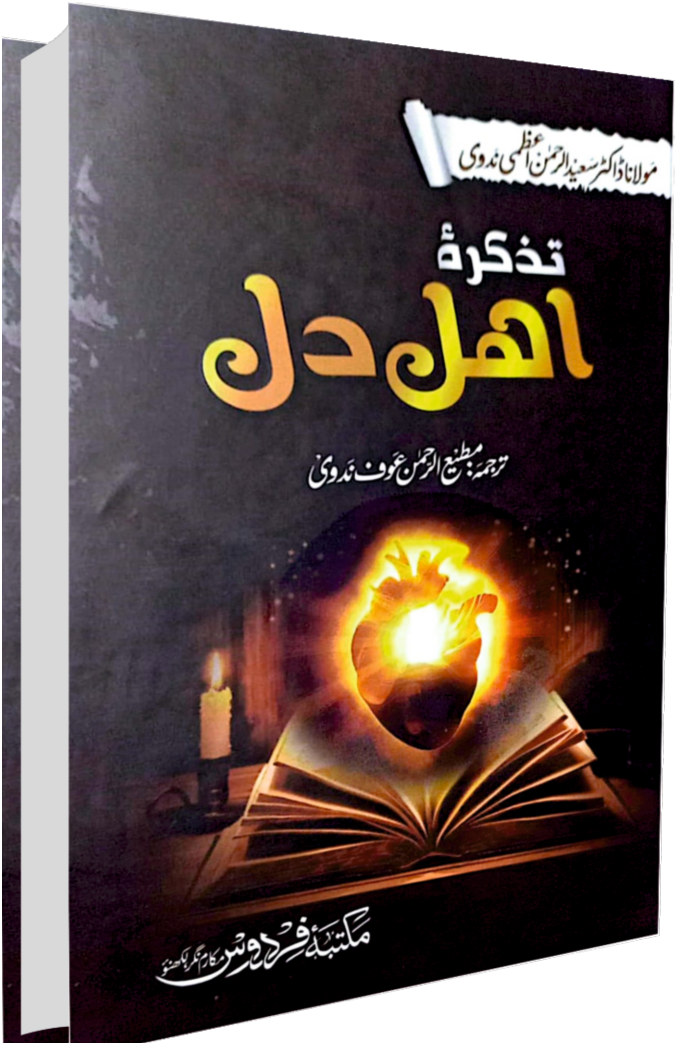
مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی
تذکرۂ
اہل دل
ترجمہ: مطیع الرحمن عوف ندوی
مکتبۂ فردوس
مکارم نگر، لکھنؤ

سلسلة من أعلام التاريخ
ساعة مع العارفين
الجزء الأول
سعيد الأعظمي النّدوي
مكتبة الفردوس ـ لكناؤ (الهند)
سلسلة من أعلام التاريخ
ساعة مع العارفين
الجزء الثاني
سعيد الأعظمي النّدوي
مكتبة الفردوس ـ لكناؤ (الهند)